نگار

قیمت ۸ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شایع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائے گا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ ۔ ششماہی تین روپیہ
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۲ — فہرست مضامین اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء — شمارہ ۴

ملاحظات ———— ۲
بنی فاطمہ کی سیاسی تحریکیں ــــ عبد المالک آروی ۹
ناموس خاندان ــــ اسد اللہ کاظمی ایم اے ۱۹
دین مسیحی اور صنف نازک کی تحقیر ———— ۲۸
عصمت بی بی از بیچارگی ــــ میر حسن جامعہ عثمانیہ ۳۹
مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ ــــ مشیر احمد بی اے ۴۲
تاریخ کا ایک گم شدہ ورق ———— ۵۱
انتخاب کلام افسوس ———— ۵۴
سامعہ سے دل تک ———— ۶۳
اعتبارات ———— ۶۴
باب الاستفسار ———— ۶۵
یہاں وہاں سے ———— ۶۸
انسان اور کائنات (نظم) علی اختر ———— ۷۰
زندگی (نظم) ———— باقی صدیقی ———— ۷۲
شعلۂ سینا (نظم) ———— کوکب شاہجہانپوری ۷۳
روداد عمل (نظم) ———— علام ———— ۷۴
غزلیات :- آسی الدنی - شاد صابری - ۷۵
" ــــ عابد شاہجہانپوری - فرخ بنارسی ۷۶
" ناطق گلاوٹھوی - محمود الہ آبادی ۷۷
معلومات ———— ۷۸ تا ۸۰
تذکرہ معرکہ سخن ــــ عبد الباری آسی ــــ ۱۲۹ تا ۱۴۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۴	اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء	جلد ۲۲

ملاحظات

آخر کار سید سلیمان صاحب ندوی سے ضبط نہ ہوا اور اُنھوں نے بھی ستمبر کے معارف میں پانچ سطریں اڈیٹر نگار کے ملحدانہ مضامین کے متعلق سپرد خامہ کرہی دیں۔

بصورتِ سبزہ لفے کہ از کمر گزرد

اس دوران میں عبد الماجد دریا بادی نے سچ کے صفحات پر جو کچھ لکھا اس کو تو میں نے اس لئے قابلِ اعتنا قرار نہیں دیا کہ اب سچ کا جھوٹ بہت سے لوگوں پر ظاہر ہو چکا ہے، لیکن سید سلیمان صاحب کا (جو اپنے کو صاحب معارف اڈیٹر سمجھتے ہیں) پھر اسی ساز کو چھیڑنا ہر چند مستبعد تو نہیں (کیونکہ سالِ گزشتہ فتنۂ نگار کے متعلق عبد الماجد کے پروپگنڈا کے سلسلہ میں ان حضرت کی ذہنیت و بلندیٔ اخلاق کا بھی کافی مطالعہ کر چکا ہوں) لیکن قابل ذکر ضرور ہے۔

اڈیٹر معارف نے ماہ ستمبر کی اشاعت میں مجھ پر دو الزام قائم کئے ہیں ایک یہ کہ میں نے اپنے ملحدانہ مضامین سے بصدق دل توبہ کا اعلان کیا تھا لیکن پھر ویسے ہی مضامین لکھ رہا ہوں اور دوسرے یہ کہ آئندہ مذہبی مضامین

کی علام اشاعت کا شریفانہ وعدہ کیا تھا لیکن باز نہیں آتا۔

پہلا الزام تو اس لئے غلط ہے کہ نہ کبھی نگار میں ملحدانہ مضامین شایع ہوئے اور نہ میں نے کبھی اس امر کا اعتراف کیا کہ نگار میں ملحدانہ مضامین شایع کئے جاتے ہیں بلکہ میں نے صاف الفاظ میں ظاہر کیا تھا کہ نگار کے تمام مذہبی مضامین خلوص نیت کے ساتھ خدمت دین و مذہب کے سلسلہ میں لکھے جاتے ہیں۔ لیکن اگر مسلمانوں کی کسی جماعت کو اُن سے تکلیف پہونچتی تو آئندہ سے اس نوع کے مضامین کا سلسلہ بند کر دیا جائیگا۔ چنانچہ گزشتہ جنوری سے اس وقت تک کوئی مضمون ایسا نہیں شایع ہوا جو مذہب اسلام کے متعلق لکھا گیا ہو اور اس سے کسی کو شکایت پیدا ہو سکے ۔ دوسرے الزام کے متعلق مجھے حیرت ہے کہ انھوں نے کیونکر اس کو پیش کرنے کی جرات کی ۔ کیا ان کی جماعت کی وہ آخری تحریر (جو حقیقت میں شایع ہوئی تھی) اُن کے سامنے نہیں ہے جس کی رو سے معاہدہ وغیرہ کو کالعدم قرار دیکر میرے خلاف مقدمہ چلانے کی طیاریاں شروع کی گئی تھیں، اور کیا سید سلیمان صاحب کو مینے اسی وقت ذریعہ تحریر اطلاع نہیں دیدی تھی کہ اگر مقدمہ چلانے کی کارروائی کو ختم نہ کیا گیا تو پھر میں آزاد ہوں اور مجھ پر معاہدہ کی کوئی پابندی عاید نہ ہوگی۔ اس کے بعد جب وہ لکھنؤ میں میرے مکان پر تشریف لائے تو کیا میں نے زبانی پھر اسی امر کا اظہار ان سے نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا انھیں بھی معلوم ہے اور مجھکو بھی ۔ مقدمہ چلانے کے لئے حصول اجازت کی غرض سے موریل کی طیاریاں، ہوم ممبر کے پاس جا جا کر میرے خلاف زہر افشانیاں، بھوپال ہاؤس میں بیٹھ کر اجتماعی قوت کے ساتھ مجھ کو قید و بند میں ڈالنے کے مشورے کیا ایسے واقعات ہیں جنکو بھلایا جا سکتا ہے۔ اور کیا سید سلیمان کہہ سکتے ہیں کہ وہ خود ان تمام مساعی میں ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے کام نہیں کر رہے تھے ۔ چنانچہ موریل پر بہت سے حضرات کے دستخط حاصل کر کے اُسکو گورنر یوپی کے پاس بھیجا گیا، لکھنؤ کے ایک خان بہادر رئیس کو مقدمہ بازی کے تمام مصارف اٹھانے کے لئے طیار کیا گیا، کوشش کر کے سرکاری مشیر قانونی سے اپنے موافق رائے لکھوائی گئی۔ الغرض مقدمہ چلانے کے لئے وہ کونسا دقیقہ کوشش کا تھا جو اُٹھا رکھا گیا۔ لیکن خدا بھلا کرے نواب سر مزمل اللہ خاں کا جو اُس وقت ہوم ممبر تھے کہ انھوں نے انجام و عواقب پر نظر ڈالکر ۔۔۔ اور نیز اس خیال سے کہ میں نے آئندہ کے لئے اس نوع کے مضامین کی اشاعت روک دی ہے، موافقت نہیں کی، ورنہ یہ حضرات تو اپنے مقدور بھر سبھی کچھ میری تباہی کے لئے کر چکے تھے۔ پھر کیا سید سلیمان صاحب اسی کو معاف کرنے کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور کیا ناکامی کا نام رحم و کرم رکھ کر خفت کو اسی طرح مٹایا جاتا ہے ۔ آج سید سلیمان یہ لکھنے کے لئے تو طیار ہیں کہ "پھر بھی وہ شریف مسلمان اپنے ملحدانہ مضامین ابتک اسی طرح شایع کر کے اپنے اسلام و شرافت کا برملا اعلان کر رہا ہے"۔ لیکن اخبار حقیقت کا وہ آخری اعلان جو ان کی جماعت کی طرف سے شایع ہوا ہے ان کے سامنے نہیں جس کی رو سے معاہدہ کالعدم ہو چکا ہے اور "وہ شریف مسلمان" خود انھیں کے قول کے مطابق سب کچھ لکھنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر سید سلیمان نے

اس سلسلہ میں کوئی مصلحانہ روش اختیار کی ہوتی، اگر انھوں نے میری تحریر موصول ہونے کے بعد مقدمہ کی کارروائی کو ختم کردینے کا مشورہ دیا ہوتا، تو میں کہہ سکتا تھا کہ انھوں نے عفو و درگزر سے کام لیا اور اب ان کو میرے اوپر یہ الزام رکھنے کا حق حاصل ہے، لیکن جب یہ کچھ نہیں ہوا تو پھر کس منھ سے وہ معافی، اور توبہ و معذرت کا ذکر کرتے ہیں اور جس معاہدہ کو وہ کالعدم قرار دے چکے ہیں اس کی پابندی مجھ سے کس اصول کی بناء پر چاہتے ہیں۔

یہاں تک تو خیر الزامی جواب ہوا ان کے اعتراضات کا۔ لیکن اب میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ وہ مجھے ملحد کیوں کہتے ہیں اور نگار میں کون سے ایسے مضامین شایع ہوئے ہیں جنکو کفر و الحاد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

وہ شخص جو خدا کو ایک قوت "فعال لما یرید" مانتا ہو، جو رسول اللہ کو بڑا زبردست نبی تسلیم کرتا ہو، جو ہمیشہ اعلان کرتا رہتا ہو کہ اسلام ہی دنیا کا تنہا ذریعہ امن و نجات ہے، کیا اسے صرف اس لئے ملحد قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ فروع میں سید سلیمان یا کسی اور مولوی کا پیرو نہیں؟ وہ شخص جو توحید ربانی کا "وحدت وجودی" کی حد تک قایل ہے جو رسول کی سیرۃ کو پاکیزہ ترین نمونہ اخلاق و انسانیت کا قرار دیتا ہے اور جو اسلام کو مذہبیات کی دنیا میں "آخری لفظ" کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، کیا اسے صرف اس بناء پر کافر و بیدین بنایا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کو خود سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور مفسرین کی کورانہ تقلید نہیں کرتا ـــــ وہ شخص جو تمام کائنات کو مظہر قوت ربانی قرار دیتا ہے، جو اُسوۂ محمدی کو بہترین آسوۂ انسانیت سمجھتا ہے اور جو قرآن مجید کو بے مثل صحیفۂ رشد و ہدایت باور کرتا ہے، کیا اُسے صرف اس دلیل پر کافر و مرتد کہہ سکتے ہیں کہ اس کے مطالعہ کا زاویۂ نگاہ خود اس کا ہے اور دوسرے سے استعارہ نہیں کیا گیا ـ حیران ہوں کہ ان لوگوں کی عقلوں کو کیا ہو گیا ہے، یہ کیا سمجھ رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں ـ سچ ہے ؎

پیمانہ براں رند حرام ست کہ غالب
در بیخودی اندازۂ گفتار نہ داند

آپ کی سمجھ میں تو کبھی نہ آئے گا لیکن آیئے میں بتا دوں کہ مجھ میں آپ میں اختلاف کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ چونکہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو ہر زمانہ، ہر ملک، اور ہر قوم کے لئے موزوں ہو سکتا ہے اس لئے اس میں ہر زمانہ کا ساتھ دینے کی لچک پائی جاتی ہے ـ اور اس کی تعلیم ہر شخص کے لئے قابل قبول ہے ـ لیکن آپ کہتے ہیں کہ نہیں اسلام کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے وہی ہے جو آپ فرماتے ہیں اور اس لئے اسلام صرف اہل عرب کے لئے تھا اور اسی زمانہ کے لئے موزوں تھا جب اس کا ظہور ہوا ـ میں کہتا ہوں کہ اسلام فطری مذہب ہے اور اگر اس کا صحیح مفہوم پیش کیا جائے تو ہر شخص اس کی صحت پر ایمان لا سکتا ہے، اس لئے میں پہلے اصول صداقت قائم کرتا ہوں اور پھر قرآن مجید کی تعلیمات پر روشنی ڈالتا ہوں آپ فرماتے ہیں نہیں، اسلام صرف مسلمانوں کا مذہب ہے اور مسلمانوں ہی کے سامنے پیش ہونا چاہئے، اسلئے آپ پہلے اپنے مفروضات و مزعومات کے لحاظ سے قرآن پر ایمان لانے کی ہدایت کرتے ہیں اور پھر اس کو لوگوں سے

تسلیم کراتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اصول انسانیت پر اپنی تعلیم کی بنیاد قایم کی اور تمام عالم کو ایک "مرکز اخوت" پر جمع ہونے کی دعوت دی اسی لئے میں فروع کی پابندی کو لوازم مذہبی میں داخل نہیں سمجھتا اور تمام مذاہب کو سچا سمجھتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ نہیں اسلام نے عصبیت و افتراق کی تعلیم دی ہے اور "جامعۂ انسانیت" کا قیام اس کا مقصود نہیں، اسی لئے آپ دوسروں کو برا کہتے ہیں اور کافر و ملحد وغیرہ کہکر بیزاری کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام نام ہے صرف تکمیل اخلاق کا، آپ کہتے ہیں نہیں اخلاق ہوں یا نہ ہوں صرف ارکان مذہب کی پابندی کافی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ خدا سے محبت کرنا سیکھو، اور آپ فرماتے ہیں اس سے ڈرو، میں کہتا ہوں کہ اخلاق نبوی کو انسانیت کا بہترین نمونہ سمجھکر اس کا اتباع کرو اور آپ فرماتے ہیں کہ نہیں پہلے اس کے معجزات و محیر العقول باتوں کو باور کرو اور پھر کچھ اور دیکھو، میں کہتا ہوں کہ اسلام نام روزہ و نماز کا نہیں ہے آپ فرماتے ہیں اسلام صرف اسی کا نام ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام نام نہ لمبی ڈارھی کا ہے نہ عبا و عمامہ کا آپ فرماتے ہیں کہ نہیں یہی تو اسلام کی نشانیاں ہیں۔

میں کہتا ہوں ملایکہ نام ہے ان قوائے کا منہ کا جن کو خدا نے انسان کے اندر اپنے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ودیعت کر دیا ہے، آپ کہتے ہیں کہ نہیں ملایکہ ایک مخلوق ہے "حیز مکان و زماں" سے متعلق جو ہاتھ پاؤں رکھتی ہے اور جس کے بال و پر ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جنت و دوزخ نام ہے انفرادی، قومی و روحانی احساس عروج و زوال کا آپ کہتے ہیں کہ نہیں اس کا تعلق ہادی لذائذ سے ہے، میوہ دار درختوں سے ہے، شہد و لبن سے ہے، خوبصورت عورتوں اور حسین لڑکوں سے ہے۔ میں کہتا ہوں اچھا کام خود آپ اپنی جزا اور برا کام آپ اپنی سزا ہے، آپ فرماتے ہیں نہیں اچھے کام کا عوض حور و قصور ہونا چاہیے اور برے کام کی پاداش نار و جہنم و ماء حمیم میں کہتا ہوں کہ خدا کی عظمت و بزرگی اس سے بہت زیادہ ہے کہ وہ ہمارے افعال سے متاثر ہو کر جذبہ تحسین و انتقام اپنے اندر پیدا کرے، آپ فرماتے ہیں نہیں وہ دنیاوی بادشاہوں کی طرح خفا بھی ہوتا ہے اور خوش بھی میں کہتا ہوں کہ جو خدا روزانہ بیشمار کرۂ زمین سے ہزاروں لاکھوں گنا بڑی بناتا بگاڑتا رہتا ہے اور جس کا یہ مشغلہ ازل سے ابد تک جاری رہنے والا ہے، وہ زمین ایسے حقیر کرہ کی ذلیل مخلوق کو تباہ کرنے کے بعد کیوں دوبارہ زندہ کرنے لگا، اس کو کیا غرض ہے، اس کا اس میں کیا فایدہ ہے کیا مصلحت ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ نہیں خدا کی عظمت صرف اسی ایک کرہ سے متعلق ہے اور اس کی خدائی کا مفہوم اسی طرح ثابت ہو سکتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی لوگوں نے کہا ہے اور وہ اسلام سے خارج نہیں سمجھے گئے۔ لیکن آج میں باوجودیکہ وحدانیت کا قائل ہوں، رسالت رسول کا ماننے والا ہوں، قرآن پاک کی بلند تعلیمات پر ایمان رکھنے والا ہوں، کافر قرار دیا جاتا ہوں، ملحد بتایا جاتا ہوں، اور بیدینی کا سب سے بڑا علمبردار ہوں۔ کیوں ؟

وائے گر پردہ ازیں راز نہاں برخیزد

آئیے آج کی صحبت میں مختصراً اس راز کو بھی ظاہر کر دوں جن حضرات نے شروع سے نگار کا مطالعہ کیا ہے وہ

اس حقیقت سے بیخبر نہیں ہیں کہ میرا موضوع سخن ہمیشہ علماء سو کا گروہ رہا ہے، اور میں نے ان کے حرکات ناشائستہ ان کے اخلاق ذمیمہ ان کے افعال رکیکہ اور ان کے مشاغل سخیفہ کو بے نقاب کر کے لوگوں کو بتایا ہے کہ ان کا وجود اللہ کا عذاب ہے، ان کی ہستی خدائی لعنت ہے جس نے مسلمانوں کو گھیر رکھا ہے۔ ان کا مقصود زندگی صرف ریا و مکر سے دولت کمانا ہے، اور ان کو مطلق پرواہ نہیں۔ اگر ان کی تعلیمات سے اسلام و صاحب اسلام دنیا میں بدنام ہو جائے یہ مذہب اسلام کو بے عقلیوں کا مجموعہ بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ یہ موضوع احادیث کو سامنے رکھ کر لغو و مہمل روایات کو اسلام سے منسوب کر کے مذہب کو ذلیل کر رہے ہیں، یہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے انسانوں کی عقلوں پر مہر لگا کر قرآن مجید پر غور و خوض کرنے کو حرام بتا رہے ہیں، یہ ذہنی و عقلی آزادیاں سلب کر کے مسلمانوں کو درجۂ انسانیت سے گرا کر حیوان بناتے جا رہے ہیں، یہ اس دور علم و روشنی میں ہمیں پھر جہل و تاریکی کی طرف لئے جا رہے ہیں اور وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو ایک خود غرض، نفس پرست انسان نما حیوان کر سکتا ہے۔ میں نے قرون اولی کی تاریخ سے، عہد عباسیہ و امویہ کے واقعات سے، حکومت ترکی و ایران کے حالات سے، اور افغانستان کے انقلاب حالیہ کی روداد سے لوگوں پر ظاہر کیا کہ اس جماعت نے جو اپنے کو علمبردار مذہب بتاتی ہے انسانیت پر کیا کیا مظالم روا رکھے ہیں، اخلاق کا خون کس بیدردی سے بہایا ہے اور عروج و ترقی کے پامال کرنے میں ان کی دراز دستیوں نے کیا کیا کام کئے ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ مجھ سے زیادہ ان کا دشمن اور کون ہو سکتا تھا، اور اس کا انتقام لینے کے لئے وہ حسب معمول سوائے مذہب کے اور کس چیز کی آڑ لے سکتے تھے۔ پھر اگر مذہب اسلام حقیقتاً نام ہے انھیں عقاید و تعلیمات کا جو ان کی طرف سے پیش کی جا رہی ہیں، انھیں اخلاق کا جو ان میں پائے جاتے ہیں، اسی محبت و رواداری کا جو ان کی طرف سے ظاہر ہو رہی ہے اور اسی وسعت نظر و پر مایگی کا جو ان کے اقوال و افعال کی سرمایہ دار ہے، تو میں نہایت صفائی سے ایک بار اور ہمیشہ کے لئے یہ اعلان کئے دیتا ہوں کہ

میں مسلمان نہیں ہوں

اور آج سے میری تمام تحریرات ایک ایسے شخص کی تحریرات سمجھی جائیں جسے اسلام سے کوئی علاقہ نہیں۔ لیکن اگر اسلام ضمیر و خیال کی آزادی کو نہیں چھینتا اگر وہ فکر و رائے کی حریت کا دشمن نہیں ہے، اگر وہ بغیر اطمینان نفس پیدا کئے ہوئے بہ جبر اپنی حقیقت کسی سے تسلیم نہیں کراتا، اگر وہ مجموعہ مزخرفات و خرافیات نہیں ہے اور اگر وہ ہر شخص کے لئے ہر زمانہ میں دستگیر و رہنما بن سکتا ہے تو اے مسلمانو، میں تمھیں سے پوچھتا ہوں کہ ان مولویوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ مجھے اسلام سے خارج کریں ان کو کیا منصب حاصل ہے کہ وہ ایک توحید خداوندی کے اقرار کرنے والے کو کافر کے لقب سے یاد کریں۔ جس طرح وہ مجھے ملحد و بیدین کہتے ہیں میں بھی انھیں کہہ سکتا ہوں، اور ان کے نقطۂ نظر سے اگر میں غلطی پر ہوں تو میرے نقطۂ نظر سے وہ بھی گمراہی میں مبتلا ہیں مجھے بھی انھیں کی طرح اپنے آپ کو مسلمان کہنے اور مسلمان سمجھنے کا حق حاصل ہے میں بھی اسلام و تعلیمات اسلام پر غور کر سکتا ہوں خدا نے مجھے بھی عقل عطا کی ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ مجھے کافر و ملحد کہتے ہیں وہ خود کافر و ملحد ہیں کیونکہ میرے نزدیک

وہ خود تعلیمات اسلامی سے منحرف ہیں، رسول کی توہین کرتے ہیں، مذہب کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں اور خدا ان سے بیزار ہے۔ میں ناظرین نگار کو یقین دلاتا ہوں کہ مولویوں کی جنگ مجھ سے نہ مذہب سے کوئی تعلق رکھتی ہے نہ دین کی ہمدردی سے بلکہ یہ حربہ انکا صرف اس لئے ہے کہ میں ان کے خلاف کیوں لکھتا ہوں، ان کی حقیقتوں کو کیوں بے نقاب کرتا ہوں۔ سو انھیں معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اب ان کے قصر عظمت و پندار کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں، انکی مذہبیت و اخلاق کے چہرہ سے پردہ اُٹھ چکا ہے اور دنیا اُن سے متنفر ہو کر پیچھے ہٹ رہی ہے۔ افسوس ہے کہ آج ہندوستان میں حکومت اسلامی نہیں ورنہ ہندوستان اُن کے عذاب سے کب کا نجات پا چکا ہوتا۔ آج ترکی حکومت کی ترقی کی بنیاد صرف اسی جماعت کے انہدام پر قائم ہے اور ایران کی بیداری کا آغاز اسی گروہ کے بیدست و پا کر دینے سے ہوتا ہے

جب کوئی زبردست قوت ان کے مقابلہ میں آتی ہے تو یہ حکومت برطانیہ کا دروازہ کھٹکھٹانے لگتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں کہ "قانون کب تک اس قسم کے شریروں کو موقع دیتا رہیگا" حالانکہ اس نوع کا احتجاج اُن کے ضعف کی دلیل ہے، اُن کی عقلی بے مائگی کا ثبوت ہے۔ اور ایک ایسا اظہار عجز ہے جس سے ہر خوددار انسان کو شرم آنی چاہیے۔ اگر ان کے مفروضہ عقاید کے خلاف کوئی صدا اٹھتی ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ عقلی دلائل سے اس کا جواب دیں نہ یہ کہ حکومت کے سامنے دامن پھیلا کر کھڑے ہو جائیں۔ علاوہ اس کے مجھے حیرت ہے کہ اگر میں واقعی ملحد ہوں تو اُن کو کیوں تکلیف پہونچ رہی ہے کیا اس سے پہلے کوئی ملحد پیدا نہیں ہوا کیا اس وقت دنیا میں میرے سوا کوئی کافر و ملحد نہیں پایا جاتا پھر ایک میرے ہی خلاف یہ جہاد کیوں ہے۔ میرے ہی اوپر کیوں اس قدر عنایت صرف کی جاتی ہے۔ خدا کی خدائی میں لاکھوں غیر مسلم و بیدین پائے جاتے ہیں، آپ کہاں تک سر پیٹیں گے، کب تک غم اٹھائیں گے اور آپ کے اس واویلا کو سنتا کون ہے۔ میں اگر اکابر مذہب کو گالیاں دوں، کسی کی توہین کروں تو بیشک شکایت کا موقع ہے لیکن جب یہ کوئی بات نہیں ہے تو پھر برہمی کے کیا معنی۔ آپ جب مجھے کافر بنا چکے، ملحد قرار دے چکے تو پھر کیوں اعتنا کرتے ہیں، سمجھ لیجئے کہ جہاں اور غیر مسلم جماعت کو دوزخ کا ایندھن بننا ہے وہیں مجھے بھی جانا ہے لیکن اگر ان کا مقصود واقعی مجھے راہ راست پر لانا اور اپنا تبلیغی فرض ادا کرنا ہے تو میں سید سلیمان ندوی اور ان تمام علماء کرام کو جو اُن کے ہم آہنگ ہیں کھلا ہوا چیلنج دیتا ہوں کہ وہ کسی مجمع میں جو بالکل غیر جانبدار لوگوں پر مشتمل ہو اپنے اسلام کو پیش کریں، پھر مجھے موقع دیں کہ میں نے جو کچھ اسلام کو سمجھا ہے اسے بیان کروں اور اس کے بعد اس مجمع سے فیصلہ چاہیں کہ وہ کس کو پسند کرتے ہیں اور یہ بھی جانے دیجئے، خود مجھے موقع دیں کہ میں اُن سے اسلام کی حقیقت کو سمجھوں اور اگر وہ مجھے سمجھا سکے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ میں بغیر ایک لمحہ کا پس و پیش کئے ہوئے سر عجز جھکا دوں گا اور انھیں جیسا مسلمان ہونے کا اقرار کر لونگا۔ ورنہ یوں تیغ و تفنگ، یا حکومت کی امداد سے کسی کو زبردستی مسلمان بنانا، یا کسی کی آزادی خیال کو چھیننا، تو اسلام کی حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ چنگیز و ہلاکو اس سے

کر چکے ہیں لیکن دنیا نے انھیں جیسا سمجھا وہ آپ کو بھی معلوم ہے اور ہمیں بھی ——

میں حضرات علماء کرام کو پھر توجہ دلاتا ہوں کہ اس دور علم و عقل میں اگر وہ مذہب اسلام کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ انھیں حربوں سے جواب دیں جن سے مخالفین کام لے رہے ہیں۔ اگر صرف قرآن مجید اور احادیث پر اپنے دلائل کی بنیاد آپ قائم کرتے ہیں تو اس کو ایک مسلمان تو مان لے گا، لیکن غیر مسلم کو آپ کیونکر ساکت کر سکتے ہیں جب تک آپ پہلے قرآن مجید کی صداقت نہ ثابت کر دیں۔ اس لئے اب آپ اپنے منقولات کو تو تہ کر کے رکھ دیجئے اور صرف معقولات کو ذریعۂ دفاع قرار دیجئے اگر آپ کے بس کی بات ہے، ورنہ دوسروں کو یہ خدمت انجام دینے دیجئے اور ان کو برا نہ کہئے کیونکہ ان کا مقصود واقعی اس سے اسلام کی خدمت ہے۔

آپ حضرات کو مطلق خبر نہیں کہ علوم جدیدہ نے کتنی راہیں اعتراضات کی کھول دی ہیں اور تمام مذاہب عالم کا تار و پود اس وقت بکھرا جا رہا ہے۔ پھر اگر آپ کا اسلام ایک حقیقت مبرہن ہے، ایک صداقت واضحہ ہے، تعلیم فطرت ہے، اقتضاء عقل و فراست ہے تو آپ کیوں نہیں آگے بڑھتے اور لوگوں کے دلوں سے ان خدشات کو دور کرتے جنھوں نے ان کے ایمانوں کو متزلزل کر رکھا ہے۔ لیکن آپ کو اتنا ہوش کہاں، آپ کو مذہب کی حمایت سے کیا واسطہ، رہتا ہو رہے، مٹتا ہو مٹے، آپ کو تو صرف قورمہ پلاؤ کھلانے کے لئے ایک احمق جماعت کی ضرورت ہے سو ہندوستان میں اس کی کمی نہیں۔ کھا کھا کر "لحم و شحم" میں برابر اضافہ کرتے جائیے اور جب کوئی دکھتی ہوئی رگ پکڑے تو چیخ کر حکومت سے فریاد کیجئے کہ دیکھئے فلاں شخص ہمیں ستاتا ہے۔

اگر سید سلیمان طیار ہوں تو میں ان اعتراضات کو پیش کر دوں جو اس وقت اسلام پر عاید ہوتے ہیں، ان خدشات کو بیان کر دوں جو اس وقت ۹۰ فی صدی جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے دلوں میں پائے جاتے ہیں اور پھر دیکھوں کہ ان کا جواب دینے میں وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ یا یہ ملحد بیدین ——

میں حیدرآباد میں ۱۱ ستمبر سے مقیم ہوں اور غالباً وسط دسمبر تک قیام پر مجبور رہوں گا، کاتب صاحب بھی میرے ساتھ ہیں اور یہیں سے کاپیاں طیار کر کے لکھنؤ روانہ کی جاتی ہیں۔ منیجر مع اپنے دفتر کے وہیں ہیں ——
جو حضرات خصوصیت کے ساتھ مجھ سے مراسلت کرنا چاہیں وہ امپیریل پوسٹ آفس حیدرآباد دکن کی وساطت سے میرے نام خطوط روانہ کریں۔ دفتر کے متعلق جو خطوط ہوں وہ براہ کرم براہ راست لکھنؤ کے پتہ سے روانہ کئے جائیں ——

اس سے قبل جب میں جولائی میں یہاں آیا تھا تو مولانا ہوشؔ بلگرامی اور راجہ نارائن پرشاد صاحب کی لطیف صحبتوں میں تقریباً روزانہ راجہ دھن راجگیرجی صاحب کا ذکر سنا کرتا تھا۔ کیونکہ راجہ صاحب موصوف اُس وقت بنگلور و جوارِ بنگلور کی دلکش فضا میں سیاحت فرما رہے تھے اور میری واپسی تک مراجعت نہ ہوئی تھی۔

اس مرتبہ لکھنؤ چھوڑنے سے قبل ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ :-

"یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور"

اور جس وقت سکندر آباد اسٹیشن پر مولانا ہوشؔ سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے بھی اس کی تصدیق فرمائی۔ دلولۂ شوق کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں اولین فرصت میں راجہ صاحب موصوف کے دولت کدہ پر حاضر ہوتا، لیکن کچھ تو انتظام قیام کی ابتدائی دشواریوں میں الجھے رہنے کی وجہ سے اور کچھ اس لئے بھی کہ راجہ صاحب موصوف کا مزاج نادرست تھا، یہ حاضری ٹلتی رہی۔ آخر کار وہ دن آیا جس کو میں تاریخ سیاسیات ہند کا نہایت اہم دن قرار دیتا ہوں یعنی ٹھیک اسی دن جب کہ لوگوں کے دل مہاتما گاندھی کی روزہ شکنی کے خیال سے لبریزِ مسرت تھے۔ شام کو مولانا ہوشؔ اور مولوی حکیم مقصود علی خاں صاحب (جو یہاں کے نہایت ہی سربر آوردہ و حاذق اطبا میں سے ہیں اور علاج سے قبل ہی نصف مرض اپنی پرخلوص گفتگو سے زائل کر دیتے ہیں) میری فرود گاہ پر تشریف لائے اور راجہ صاحب موصوف کا فرمان طلب و حاضری سنا کر مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔

آج کل راجہ صاحب اپنے اُس قصر میں مقیم ہیں جو بلدہ کے ایک بعید ترین حصہ میں تعمیر کیا گیا ہے اور جو ماحول کی آبادی و مکانات کو دیکھتے ہوئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو شب تار میں ماہ چاردہم کو حاصل ہے۔ یہ قصر معہ اپنے تمام ملحقہ عمارات و تفریح گاہوں کے نہایت وسیع حصۂ زمین کو محیط ہے، اتنا وسیع کہ یہاں داخل ہونے کے بعد ایک انسان یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس احاطہ سے باہر شاید کسی انسانی آبادی کا وجود ہی نہیں ہے۔ میں نے چل پھر کر قصر کے اندرونی و بیرونی مختلف حصوں کو دیکھا، ان کی آراستگی وزیبایش میں جو دولت و ذہانت صرف کی گئی ہے ان کا مطالعہ کرتا رہا، تمدن جدید کے ان تمام اسباب آرائش کو، جو تھوڑی دیر کے لئے نظریۂ فردوس کو بھی دماغ سے محو کر دیتے ہیں دیر تک دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں مغرب کی موجودہ ترقی علوم و فنون کو دعائیں دیتا رہا جس نے تمدن انسانی کے معیار کو اس قدر بلند کر کے غریبوں کی حیثیت حشرات الارض سے زیادہ نہیں رکھی۔ اور انسانی ارتقاء و حضیض کا مفہوم متعین کرنے کے لئے مادیات کی اتنی زبردست دیوار حائل کر دی ہے۔

اس قصر کے بلند ایوان، وسیع و مرتفع شہ نشین، اس کا مرمریں فرش، مرصع سقف، منقش دیواریں قیمتی تصاویر، دلفریب مجسمے، نقرئی و طلائی ظروف حریری پردے، متعدد سبزہ زار، مختلف صناعیوں کے بڑے بڑے حوض اور بجلی کی رنگین روشنیوں کے انعکاس میں قوس قزح کے رنگ پیدا کرنے والے فوارے، الغرض میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ دنیا سے الگ یہ کوئی بازیگاہ فطرت ہے، جہاں وہ ہر وقت رنگ و نور، ریشم و طلا کے ساتھ کھیلا کرتی ہے یا یہ کہ شاید میرے ہی ہاتھ الہ والدین کا چراغ آگیا ہے، اور یہ عالیشان قصر آن واحد میں میرے ہی لئے طیار ہوا ہے۔

جاہ و ثروت والے دنیا میں بہت سے پائے جاتے ہیں، لیکن دولتِ دنیا کے ساتھ، دولت دماغ بہت کم لوگوں کو میسر آتی ہے اور بہت کم دیکھا گیا ہے کہ دولت و ذہانت، ثروت و خوش سلیقگی کبھی ایک محل میں جمع ہو جائیں۔ میری زندگی میں غالباً یہ بالکل پہلا موقعہ ہے کہ ان دونوں کا اجتماع میں نے اس قدر تکمیل کے ساتھ دیکھا ہو۔ اگر راجہ صاحب اس ودیعت ربانی پر خراج تحسین حاصل کرنے کے مستحق ہیں تو اُس مبدر فیاض کو کیوں نہ سراہا جائے۔ جس نے راجہ صاحب کی ذات اور ان کے دل و دماغ کو اس کے لئے منتخب کیا۔

اس قصر کی طیاری و آرائش میں جس قدر بیدریغ دولت صرف کی گئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف ایک حمام کی طیاری میں لاکھ سے زیادہ روپیہ صرف کیا گیا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد راجہ صاحب موصوف راجہ نارائن پرشاد صاحب کی معیت میں باہر تشریف لائے اور مجھ سے مخاطبت کی تو بے اختیار عرفی کا یہ شعر مجھے یاد آرہا تھا کہ

زباں چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت

فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

راجہ صاحب ایک جوان العمر کشیدہ قامت نہایت خوش قیافہ و خوش شمایل انسان ہیں، اور باوجود دولت و ثروت کی اس فراوانی کے آپ کا انکسار آپ کی وسعت اخلاق، آپ کی فراخ حوصلگی اور سیر چشمی اس جوار میں ایک ضرب المثل کی سی حیثیت رکھتی ہے اور شاید ہی کوئی قومی، ملکی یا علمی تحریک ایسی ہو جس کو آپ کے "طلا دست افشار" کی اعانت نہ حاصل ہوتی ہو۔ سیاسی معاملات میں آپ نہایت صائب رائے رکھتے ہیں اور مذہبیات میں آپ کا مسلک صرف اخوت عامہ و انسانیت پرستی پر مبنی ہے جہاں عصبیت و تمیز نسل و رنگ کا گزر نہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد سرد خانہ میں تشریف لے گئے اور چونکہ ہمارے حکیم صاحب ایک مریض کو دیکھنے شہر چلے گئے تھے اور فضائے تقدس و اتقاء کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے، اس لئے کچھ گفتگو کا موضوع بھی بدلا، زاویۂ نظر میں بھی کچھ تبدیلی پیدا ہوئی اور اگر سامعہ ادہر امین کو دلکش سروں میں محو تھا تو ادہر بقول نسیم دہلوی :-

نگاہیں ڈوب کر رہ گئیں جام لبالب میں

آخر کار یہ صحبت لطیف جو رنگین کم مگر دلکش زیادہ تھی، ایک بجے رات کو ختم ہوئی اور واپس آنے کے بعد عالم خواب میں بھی اسی کیفیت سے لذت اندوز ہوتا رہا مگر کبھی کبھی اس ڈر سے آنکھ کھل جاتی تھی کہ کہیں حکیم صاحب تو تشریف نہیں لے آئے -

---

میرے قیام کا سبب حیدر آباد میں یہ ہے کہ مہاراجہ سرصدر اعظم بہادر کی مثنوی پریم درپن کا گویا فلم طیار ہو رہا ہے اور مکالموں، گانوں اور مناظر کی نگرانی میرے سپرد ہوئی ہے - اس فلم کو یہیں حیدر آباد کی ایک لمیٹڈ کمپنی طیار کر رہی ہے جس کے مینجنگ ایجنٹ ایک انگریز میجر ریڈ ہیں اور جو اس سے قبل یہیں حیدر آباد میں ایک نہایت کامیاب فلم "شکاری" طیار کر چکے ہیں - پریم درپن کے فلم کو مسٹر داؤد بیگ ڈائرکٹ کر رہے ہیں جو ایک زمانہ تک یوروپ میں رہکر اس فن میں کافی دستگاہ حاصل کر چکے ہیں -

میں کوشش کر رہا ہوں کہ ہندوستانی فلموں میں جو نقائص عام طور پر نظر آتے ہیں وہ اس میں نہ پائے جائیں اور ہر ممکن حد تک تمام مناظر و گفتگو وغیرہ فطری حالت میں پیش ہو سکیں - یہ فلم غالباً دسمبر تک مکمل ہو سکے گا اور اس لئے میرا بھی اس وقت تک یہاں قیام کرنا ضروری ہے -

---

۲۰ ستمبر سے لیکر ۲۶ ستمبر کا زمانہ بھی تاریخ ہند میں ایک ایسی زبردست یادگار عزم انسانی و صداقت نیت کی قائم کر گیا ہے کہ شاید ہی اس کی دوسری نظیر پیش کی جا سکے - دنیا میں مصلح و ریفارمر بھی آتے ہیں اور قائد و رہنما بھی، ماہرین سیاست بھی نظر آتے ہیں اور قوم کے فدائی بھی، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ سب اسی منزلت و مرتبت کے حامل ہوتے ہیں جو اس وقت مہاتما گاندھی کو حاصل ہے اور کیا اُن کی آواز میں وہی اثر ہوتا ہے جو اس نحیف الجثہ حقیر صورت انسان کی آواز میں پایا جاتا ہے -

وہ ایک بار اعلان کر دیتا ہے کہ میں ۲۰ ستمبر سے اپنی زندگی کا آخری روزہ شروع کر دونگا اور شرق سے لیکر غرب تک ایک اضطراب کی لہر دوڑ جاتی ہے، وہ عہد کرتا ہے کہ میں اس فاقہ کو فنا کی حد تک

کھینچ لیجاؤں گا اور دنیا کی کوئی قوت اُسے اس عزم سے ہٹانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتی — کیوں؟ دنیا باور کرے یا نہ کرے، لیکن میں یقین لاتا ہوں کہ مہاتما گاندھی نے جو کچھ کیا وہ فرمانِ خداوندی کی تعمیل تھی اور جو کچھ اُنھوں نے کہا وہ یقیناً الہامِ ربانی تھا۔

کیا کوئی کہہ سکتا تھا کہ ہندو آبادی میں جو مسئلہ چھوت واچھوت کا ایک زمانۂ نامعلوم سے اُلجھا چلا آرہا تھا وہ کبھی سلجھ سکے گا۔ اور کیا یہ کسی انسان کے امکان میں تھا کہ وہ برہمن و شودر کو ایک ہی صف میں لاکر کھڑا کر دے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب خدا اپنے کسی بندہ کو اپنا پیام سنانے کے لئے چن لیتا ہے تو زبان میں یہی اثر، ارادہ میں یہی عزم پیدا کر دیتا ہے اور پھر تمام طاغوتی قوتیں اس کے سامنے اسی طرح سربسجود ہو جایا کرتی ہیں۔

اگر امم قدیمہ کے مصلحین کی ان قربانیوں سے جو اُنھوں نے نوعِ انسانی کے لئے روا رکھی ہیں انکار نہیں کیا جاسکتا، تو کوئی وجہ نہیں کہ عہدِ حاضر میں ہندوستان کے اس مصلحِ اعظم۔ اس قاید اکبر اور پیامِ خداوندی کے اس عظیم الرتبت حامل و مبلغ کی صداقت و قربانی کو نہ تسلیم کیا جائے جس نے اَب واقعۃً ایک معجزہ کی سی صورت اختیار کر لی ہے اور کر لینی چاہئے تھی

لیکن اَب سوال یہ ہے کہ ہمارے ہندوستان کی وہ دوسری قوم اَب کیا کرنا چاہتی ہے جس نے اس وقت تک اپنی ساری عمر ترکستان و عربستان ہی کی فکروں میں ضایع کر دی اور ہندوستان کے درد نے کبھی اس کو بیتاب نہ بنایا۔ اگر اس کے دماغ میں کوئی حقیر ترین ذرہ بھی عقل کا موجود ہے تو اُس کو سمجھنا چاہئے کہ یہ سب کچھ جواب ہے مہاتما گاندھی کی طرف سے ان کی حماقتوں اور شرارتوں کا جو مخلوط انتخاب کے مسئلہ میں ان کی طرف سے ظاہر ہوئیں اور انتقام ہے فطرت کا جو وہ ہمیشہ بے عقل و کج فہم قوموں سے لیا کرتی ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا مسلمان اَب بھی ہندوؤں سے چھوت قوموں کی علیحدگی کی کوئی صورت نکال سکتے ہیں اور کیا اب بھی ان کو توقع ہے کہ ہندو قوم کی تفریق ان کے انتخاب جداگانہ کو کامیاب بنا دینے والی ثابت ہوگی۔ مگر نہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ طلسم فریب اَب ٹوٹ چکا ہے، حقیقت بڑی حد تک بے نقاب ہو چکی ہے اور اگر اس کے بعد بھی مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کی لعنت کو اپنے اوپر سے دور نہ کیا تو پھر اس کے بعد غالباً کوئی دوسری نشانی قدرت کی طرف سے ظاہر ہونے والی نہیں ہے۔ اور اَب جو فیصلہ دستِ خدا میں اس قوم کے لئے انتظار کر رہا ہے وہ صرف یہی ہے کہ

کونوا قردۃ خاسئین

نیاز

بنی فاطمہ کی سیاسی تحریکیں اور ان کا تاریخی انجام

عہد امویہ و عباسیہ کی داستان خونیں کے چند صفحے

ہر انسان پر خواہ وہ زاہد شب زندہ دار ہو، یا رند معصیت کوش زندگی کے بعض ایسے معصوم اور برگزیدہ لمحے بھی گزر جاتے ہیں، جب اشیا و مناظر کی حقیقت پر بھی اُسے غور کرنا پڑ جاتا ہے پھر اُس کا موضوع فکر کبھی خود اس کی ذات ہوتی ہے اور کبھی ماورائے ذات۔ چنانچہ فلسفہ کے مختلف مذاہب، شاعری کے مختلف اسالیب اخلاقیات و عمرانیات کے مسائل اسی خیال کی تحلیل کا نتیجہ ہیں۔

سب سے پہلے انسان کی نظر زندگی اور اس کی حقیقت پر پڑتی ہے، اور اسی عقدہ کے حل کرنے کے بعد انسان ماورائے ذات کے ساتھ اپنے ربط و علاقہ کی تعیین کرتا ہے۔ حقیقت زندگی کیا ہے؟ اس کے جواب میں خیالات کا ایک عمان بے پایاں سامنے آجاتا ہے لیکن بچین قلوب کو نہ افلاطون کے "تصورات" کی موشگافیاں تسکین پہونچا سکتی ہیں نہ ارسطو کی ثنویت اور اس کے آفریدگار کی بے نیازیاں۔

ازیں چہ سود و زیاں در کمال حکمت او — کہ بوعلی مقر و ارسطو بہ انکار است

مذاہب کو ان کے پرستاروں کی انانیت اور خود غرضیوں نے سیاسیات سے زیادہ بلند سطح پر نہیں رکھا اس لئے اس کے مکارم و معالی، نشو و ارتقا کی تدریجی رفتار کے ساتھ فنا ہونے لگے اور آخرکار مذہب اپنے خود غرض پرستاروں کی وجہ سے ہلاکت و فساد کا ایک خوفناک نظام بنگیا۔ اس لئے انسان اپنی ہی طرف دیکھتا ہے، اور سوال کرتا ہے زندگی کیا ہے؟ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اگر محرومیاں اور کامرانیاں دونوں آئندہ چل کر خواب و خیال بنجاتی ہیں تو پھر ہم مستقبل کے ساتھ اس قدر آرزو مندانہ انہماک کیوں رکھتے ہیں ہم ساری آرزوؤں کو کیوں نہیں تیاگ دیتے اور پھر سوال یہ ہے کہ اس افسردگی تمنا کے بعد ہم میں جینے کا حوصلہ کیوں باقی رہتا ہے۔ غالب اپنے فلسفیانہ انداز میں اس کا جواب دیتے ہیں۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید — نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

مرزا کا عقیدہ ہے کہ زندگی محض اُمیدوں کے سہارے قائم رہتی ہے، اگر اُمیدیں باقی نہ رہینگی، تو موت اُمید بنجائیگی، یعنی انسان زندہ رہنا پسند نہیں کریگا، غالب کا یہ شعر زندگی کی بالکل حقیقت ہے۔

انسان فطرتاً رجائیت کا جذبہ لیکر آیا ہے، اور جب تک وہ زندہ رہتا ہے، محرومیوں کے باوجود مستقبل کے ساتھ ایک آرزو رکھتا ہے، زمانہ اور اس کا انقلاب یا تو انسانی قلوب کو مدفن تمنا بنا دیتا ہے، یا گلشن تمنا، لیکن انسان جب ماضی کا جائزہ لیتا ہے تو اس کی کامرانیاں بھی محرومیوں سے زیادہ ناکام نظر آتی ہیں۔ ناکامی تو خیر خلش دل بلکہ زندگی کا ساتھ دیتی ہے، لیکن کامرانیوں کا انجام تو بے کیفی اور افسردگی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ انسان کیفیت چاہتا ہے خواہ وہ درد ہو یا نشاط! رونا بھی آرزو کے وجود کی دلیل ہے، کیونکہ انسان روتا بھی اسی وقت ہے جب دل میں کوئی آرزو ہوتی ہے۔ آہ! اصل رونا تو نہ رونے کا ہے، دل کی حسرتیں ختم ہو جاتی ہیں تو آنسو بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ ظہوری اس نفسیاتی مسئلہ کے متعلق اپنے شاعرانہ انداز میں فرماتے ہیں،

گریۂ حسرت اے ظہوری چند ۔۔۔ آرزو ہا ہمہ ز دیدہ چکید

فلسفی شاعر کہتا ہے، کہ انسان کب تک روئے، ارے ساری آرزوئیں تو آنکھوں کی راہ بہ گئیں اب آرزو ہی نہیں تو روئیں کیا۔ یہ صرف شاعری نہیں ہے، بلکہ شاعر نے ایک نفسیاتی واقعہ بیان کر دیا ہے۔

الغرض ماضی کا جائزہ لینے اور مستقبل کا تجزیہ کرنے کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہونچتا ہے، کہ زندگی نام ہی در اصل ماضی کے خواب و خیال بنجانے اور مستقبل کے ساتھ آرزوؤں کی وابستگی کا، بس یہی زندگی کی حقیقت ہے۔

اب سوال یہ ہے، کہ اس انکشاف کے بعد ہم پر یاس و بے حسی کیوں نہیں طاری ہو جاتی۔ یہیں ہو بحکم نظام فطرت انسان کو اندھا بنا دیتا ہے، اور جب تک انسان کے قویٰ باقی رہتے ہیں وہ فطرت کے ذوق آرائش میں اپنی زندگی تباہ و برباد کرتا رہتا ہے، عمرانیات کا سارا ساز نشاط، حکومتوں کی ساری حکمت عملی، ذہن و جسم کی تمام پیداوار، ایک اسی فریب خیال کا نتیجہ ہیں ورنہ سلف کے تمدنی کارنامے قدما کے آثار حکومتوں کا قیام و زوال خاندانوں کا عروج و انحطاط ہمارے اندر کیوں نہیں ایک نفسی ردعمل پیدا کر دیتا ہے، آخر ہم کیوں آرزو ہائے خیالی کے دیوانے ہیں ہم دل کے اندر امیدوں کی پرورش کیوں کرتے ہیں اور ان کے پورا ہونے کے لئے اس قدر سرگرداں کیوں ہیں؟ قرآن نے اپنے اچھوتے فلسفیانہ انداز میں اس کی طرف ایک جگہ اشارہ کیا ہے،

اتبنون بکل ریع آیۃً تعبثون ۝ وتتخذون مصانع لعلکم تخلدون + (شعراء)

کیا تم ہر اونچے مقام پر ایک یادگار بناتے ہو جو بالکل عبث ہے اور بڑے بڑے محل طیار کرتے ہو جیسے ہمیشہ تم کو دنیا میں رہنا ہے۔

یہ ہے اسلامی عمرانیات کا وہ سہل و سادہ اصول جو انسان کو دنیا کی بہت سی آبلہ فریبیوں سے بچا سکتا ہے۔

لیکن انسان کے اندر جس وقت جذبۂ انانیت پیدا ہوتا ہے وہ دولت و جاہ امارت و حکومت، شہرت و عزت خود غرضی و کامرانی کے نشہ میں سرشار ہو جاتا ہے اور ایسے ذرائع ڈھونڈھنے لگتا ہے جن کی بدولت اس کو ابنائے

جنس پر تفوق و برتری حاصل ہو، یہیں سے اخلاقیات کی ساری فرومایگی شروع ہوتی ہے اور انسان سے تو امیں اخلاقی رفتہ رفتہ رخصت ہونے لگتے ہیں یہاں تک کہ وہ ایک درندہ بنجاتا ہے - جس کی بیشمار مثالیں صفحات تاریخ میں موجود ہیں - اچھا تو آیئے آج کی صحبت میں "بنی فاطمہ" کی مظلومیت اور امویہ و عباسیہ کی خون آشامیوں پر ایک نگاہ ڈال کر فطرت انسانی کی ہوسناکیوں کا مطالعہ کریں -

مختصراً اگر میں کہنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ تاریخ کے صفحات علویہ و اہلبیت کے خون سے رنگین نظر آتے ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ حضرت زید شہید کو جس طرح فنا کے گھاٹ اتار اگیا وہ ہشام و ولید کو ابدی لعنت میں گرفتار رکھنے کے لئے کافی ہے - حضرت یحییٰ بن زید کا سر کاٹ کر بی بی ریطہؓ کے آغوش میں دینا ایک ایسی وحشت ہے، جس پر چنگیز و ہلاکو بھی رشک کریں گے، محمد نفس الزکیہ اور ابراہیم کو جس غداری اور بیدردی کے ساتھ قتل کیا گیا وہ خلیفہ منصور کے دامن پر ایسا دھبہ ہے، جو کبھی نہیں مٹ سکتا - ہارون الرشید اسلامی دنیا کا ایک نامور خلیفہ سہی اس کی بیدار مغزی اس کی سیاسی الٰہیت اس کا فاتحانہ جوش و خروش مسلم لیکن آہ! یحییٰ ابن عبد اللہ محض کو امان دیکر زہر دلا دینا کیا معمولی واقعہ ہے، اور کیا اس کو آسانی کے ساتھ معاف کیا جا سکتا ہے، کیا ابو الحسین ابن علی العابد کا واقعہ اور مصائب "فخ"[1] محض اس بنا پر فراموش کئے جا سکتے ہیں کہ خلیفہ ہادی کے حکم سے یہ بلا انگیزیاں نہیں ہوئی تھیں امام محمد تقی کہا کرتے تھے -

[1] لم یکن لنا بعد الطف مصرع اعظم من فخ　　ترجمہ　　کربلا کے بعد سب سے بڑی مصیبت جو ہم پر نازل ہوئی وہ واقعہ فخ ہے -

کیا امام جعفر صادق جیسے گوشہ نشین عالم کو زہر دینا خلیفہ منصور (۱۳۶ھ - ۱۵۸ھ) کی معمولی دناءت تھی، کیا حضرت امام موسیٰ کاظم کو زہر دینے کے بعد بھی رشید (۱۷۰ھ - ۱۹۳ھ) اسلامی دنیا کا ہر دلعزیز تاجدار کہا جا سکتا ہے، کیا امام علی نقی کو زہر کا پیالہ پلا دینا خلیفہ المعتز (۲۵۲ھ - ۲۵۵ھ) کا ایسا کارنامہ ہے جس پر دنیا عباسیہ کے جاہ و جلال اور اسلامی شان و شکوہ کی داد دے سکتی ہے - الغرض کہاں تک عباسیہ کی سیہ کاریوں ... کا شمار کیا جائے، میں مانتا ہوں کہ اُنھوں نے اپنی جلالت و عظمت، علمی و سیاسی خدمات، معاشرت و عمرانی ترقیوں کے ذریعہ سے عربوں کو دنیا کی ملتوں کے سامنے بہت سربلند کر دیا، لیکن کیا دنیا میں صرف سربلندی حاصل کر لینا ہی اسلام کا اصل پیام ہے، کیا ترقی کا حقیقی معیار اسلام کے نزدیک یہی ہے کہ بغداد میں بغدیہ جیسی شاندار عمارتیں بنا دی جائیں، یونانی زبان کی خرافات کا عربی میں ترجمہ کیا جائے، عباسی حکومت کو اطراف و اکناف عالم تک وسیع کر دیا جائے، کیا یہ سب کچھ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی تھی، بالفرض ہو بھی تو بنی فاطمہ کے ساتھ اُن کا سلوک کیا ان کو اسلامی دنیا کے لئے رحمت بنا سکتا ہے -

زید شہید

حضرت زید بن امام علی زین العابدین فریادی بنکر ہشام اموی کے دربار میں تشریف لے جاتے ہیں، ہشام اپنے افسر فوج کو حکم دیتا ہے کہ زید ہمارے لشکر میں رہنے نہ پائیں حضرت زید یہ سنکر فرماتے ہیں کہ جو شخص تلوار کی زد نا پسند کرتا ہے وہ ذلیل ہوتا ہے" لوگوں نے یہ خبر دربار میں پہونچا دی ہشام سمجھا کہ آپ ضرور خروج کریں گے، وہ مکہ میں آیا، اور حضرت زید، داؤد بن علی بن عبداللہ بن عباس اور محمد ابن عمر بن حضرت علی کو گرفتار کیا اور الزام یہ لگایا کہ خالد قشیری کا مال اُن کے یہاں موجود ہے۔ جب یہ لوگ گرفتار کرکے کوفہ میں یوسف ابن عمر ثقفی کے پاس بھیجے گئے تو ان لوگوں نے قسم کھائی کہ خالد کا مال ان کے ذمہ نہیں ہے چنانچہ یوسف نے ان کو رہا کر دیا اس کے بعد شیعہ، زید کو قادسیہ سے کوفہ کی طرف لائے اور آپ سے بیعت کی۔ جو لوگ آپ کے ساتھ ثابت قدم رہے، زیدیہ کہلاتے ہیں اور جنھوں نے آپ کو چھوڑ دیا "رافضہ" کہلاتے ہیں صرف کوفہ میں زید کے ساتھ پندرہ ہزار آدمی موجود تھے، اس کے علاوہ مدائن بصرہ، واسط، موصل، خراسان رے، جرجان، جزیرہ وغیرہ کے باشندوں نے بھی ساتھ دیا۔ ۱۲۱ھ میں آپ نے لوائے خروج بلند کیا رفتہ رفتہ آپ کے رفیقوں نے آپ کو چھوڑنا شروع کیا یہاں تک کہ صف آرائی کے دن آپ کے ساتھ صرف تین سو آدمی تھے، امویہ کی طرف سے یوسف ابن عمر ثقفی دس ہزار فوج لیکر آیا تھا میدان کارزار گرم تھا کہ یوسف ابن عمر ثقفی کے ایک غلام نے جس کا نام "راشد" تھا ایک تیر مارا جس سے حضرت زید کی پیشانی زخمی ہوگئی آپ کو سواری سے اتار لیا گیا آپ کا سر مبارک مسلم ابن محمد خیاط کے گود میں تھا، آپ کے صاحبزادے یحییٰ ابن زید تشریف لائے، اور روکر کہا "ابا جان! بشارت ہو کہ آپ حضرت رسول اللہ، علی، فاطمہ، اور حسن وحسین سے ملیں گے" حضرت زید نے فرمایا "میرے عزیز بچے اب تم کیا کروگے"؟ حضرت یحییٰ نے جواب دیا "ابا جان میں تن تنہا بھی اُن سے لڑونگا" حضرت زید نے فرمایا "ہاں میرے بچے یہی کرو، چونکہ تم حق پر ہو اور وہ ناحق پر اگر انھوں نے تم کو شہید کیا تو تم جنت میں داخل ہوگے اور اگر وہ مارے گئے تو واصل جہنم ہوں گے" اس کے بعد تاریخ میں حضرت زید کا وہ حسرتناک انجام مرقوم ہے، جسے علامہ سراج الدین رفاعی نے اس طرح لکھا ہے[۵]:-

پھر تیر (آپکی پیشانی سے) نکالا گیا اور اسی کے ساتھ آپ نے رحلت کی۔ سعید بن خیثمہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہم لوگ آپ کو ایک چشمہ کے نزدیک لائے جو ایک باغ کے اندر جاری تھا آپ کی لاش دفن کر دی اور ہمارے ساتھ ایک سندی غلام تھا اُس نے یوسف کو خبر کر دی۔ صبح کے وقت آپ کی لاش چشمہ سے نکالی اور ایک کنیسہ میں سولی دیدی اور چار برس تک سولی ہی پر لٹکائے رکھا (اس عرصہ میں) ہشام نے قضا کی اور ولید ثانی ابن

۵؎ صحاح الاخبار فی نسب السادۃ الفاطمیۃ الاخیار

یزید ثانی (۱۲۵ھ - ۱۲۶ھ) نے یوسف کو لکھا کہ تم کو جس وقت میرا خط ملے فوراً اہل عراق کی طرف جاؤ اور (زید کو) جلاکر آپ کی خاک دریا میں منتشر کردو، یوسف نے سولی سے لاش اتاری اور جلاکر راکھ ہوا میں منتشر کردی،

یحییٰ ابن زید شہید حضرت زید کے چار بیٹے تھے، یحییٰ، حسین ذوالدمعہ، علیی موتم الاشبال، اور محمد حضرت یحییٰ سب سے بڑے صاحبزادہ تھے، آپ لاولد مرے حضرت زید کی شہادت کے بعد آپ مدائن میں آئے خلیفہ ولید اموی کے گورنر یوسف ابن عمر نے آپ کو بلایا آپ رے، کی طرف چلے گئے وہاں سے نیشاپور اور سرخس میں آئے اس کے بعد یوسف نے نصر ابن لیسار کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی تین دن تک سخت لڑائی ہوئی لوگوں نے جمعہ کے دن عصر کے بعد ۱۲۵ھ میں آپ کو جام شہادت پلادیا شہادت کے وقت آپ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی، آپ کا سر مبارک ولید کے دربار میں آیا، جسد مبارک سولی پر لٹکا دیا گیا، ولید نے سر مبارک مدینہ میں بھیجا کہ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی ریطہ بنت عبد اللہ بن محمد بن علی بن ابی طالب کے گود میں ڈالدیا جائے بی بی ریطہؓ حضرت شیر خدا کی پروتی تھیں آپ کی رگوں میں وہی خون جاری وساری تھا آپ نے سر کی طرف حسرت بھی نظروں سے دیکھا اور امویوں کی طرف خطاب کرکے کہا۔

شردتموہ عنی طویلا واھد تیموہ الی قتیلا
صلوٰت اللہ علیہ بکرۃ واصیلا

ایک عرصہ تک تم نے مجھکو اسکا داغ فراق دیا اور (اب) قتل کرکے اس کا تحفہ دیتے ہو، اللہ تعالیٰ کی بخششیں اسپر صبح وشام ہوا کریں

ایک غیر متعصب طالب علم امویوں کی ان سیہ کاریوں کی داستان پڑھکر حیرت میں آجاتا ہے کہ اموی مسلمان تھے یا ننگ اسلام!

بنو حسن کی سیاسی جد وجہد بنو حسن نے بدسلوکیوں کے باوجود نہ تو قایم شدہ حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی نہ سیاسیات میں کوئی حصہ لیا تھا۔ علی ثانی (امام زین العابدین) کی اولاد عزت گزیں زندگی گزارتی تھی اور علمی وفلسفیانہ مشاغل میں مصروف، انھوں نے خود کو بنی عباس کی سیاسی تحریکوں سے بالکل علیحدہ رکھا، البتہ زید شہید اور آپ کے صاحبزادہ نے مظلومیت کی بنا پر ہشام اور یزید کے خلاف اسلحہ اٹھایا اور اپنی زندگی قربان کردی۔ بنو حسن اور بنو حسین مدینہ میں رہتے تھے اور کچھ بھی قلیل جایداد کچھ تجارتی منفعت اور مدارس کی غیر متعین آمدنی پر ان کی بسر ہوتی تھی! لیکن اس فلاکت کے باوجود، مقامی باشندے ان کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، مدینہ میں خلفائے ثلاثہؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور اکابر صحابہؓ کی اولاد بھی رہتی تھی، اور یہ سب علویہ کے ساتھ علاقہ رکھتے تھے۔ علویہ کے اس اثر رسوخ اور عزت و برتری کو دیکھ کر منصور عباسی کو خوف ہوا کہ جس آسانی کے ساتھ بنی مروان تباہ ہوگئے

کہیں اس کا خاندان بھی نہ برباد ہوجائے۔ چنانچہ اُس نے مختلف طریقوں سے پتہ لگانے کی کوشش کی کہ کہیں بغاوت کا سامان تو نہیں، اُس نے اپنے آدمیوں کو یہ ہدایت کرکے علویہ کے یہاں بھیجا کہ وہ اُن کے معتمد بنجائیں اور ان کو بلاخوف بولنے کی ترغیب دیں، تاکہ اس کو دار و گیر کے لئے حجت مل جائے۔ اس طرف جب امویہ کی حکومت کو زوال ہو رہا تھا تو فطری طور پر علویہ اس سے دلچسپی لے رہے تھے، مدینہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں بہت سے بنو حسن اور بنو حسین جمع ہوئے، منصور بھی اس میں شریک تھا، اس جمعیت میں امام حسن کے پوتے محمد (جو بنو حسن کے سردار تھے) خلیفہ منتخب ہوئے آپ کی صداقت و شرافت اخلاق کے باعث آپ کو "نفس الزکیہ" کا لقب ملا تھا۔ سارے مجمع نے مع ابو جعفر منصور متفقہ طور پر آپ کی لیاقت و فضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ سے بیعت کی جب منصور تخت خلافت پر بیٹھا، اس ناقابل فراموش بیعت کی یاد سے اس کی زندگی تاریک نظر آنے لگی، اور اس کا شک قوی ہوگیا، اور اس نے محمد نفس الزکیہ اور آپ کے بھائی ابراہیم کو گرفتار کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ لوگ فرار ہوگئے اس نے خاندان کے بڑے بڑے لوگوں کو گرفتار کیا جن میں ضعیف العمر حضرت عبد اللہ محض اور آل عثمان کے سردار محمد العثمانی بھی شامل تھے جن کی صاحبزادی ابراہیم کی زوجیت میں تھیں ان کو پابز نجیر کوفہ میں بھیجا گیا اور قلعہ میں قید کیا گیا۔ محمد العثمانی کو اہل شام بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، اس لئے اُن کی شخصیت بھی تخت عباسیہ کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتی تھی، چنانچہ آخر کار آپ کو کوڑے لگائے گئے اور پھر قتل کر دیا گیا۔ دوسروں کے ساتھ بڑی سفاکی کی گئی۔ یہاں تک کہ غریب مظلوموں نے اعتراف کیا کہ وہ اس لحاظ سے تو دور اموی ہی میں اچھی طرح بسر کرتے تھے۔ محمد اور ابراہیم کی گرفتاری کے لئے چاروں طرف لوگ سرگرم تھے، بدوُن کو بانی کے مقامات پر متعین کیا گیا کہ وہ جاسوسی کریں۔ جن لوگوں پر پناہ دینے کا شبہ تھا ان کو کوڑے مارے گئے قید کیا گیا۔ آخر نا امید ہوکر محمد نے اپنے بھائی ابراہیم کو اہواز اور بصرہ کی طرف تحریک کیلئے بھیجا، اور خود مدینہ میں تشریف لائے، منصور کے عزل کا اعلان بہ یکوقت بصرہ اور مدینہ میں ہونا قرار پایا۔ اگر یہ کارروائی کامیاب ہوجاتی تو غالب گمان تھا کہ عباسیہ کی حکومت کا خاتمہ ہوجاتا لیکن محمد پر اُن کے بھائی کی تیاریوں سے قبل اعلان کرنے کا زور دیا گیا اور اس لئے منصور باری باری دونوں پر حملہ کرنے کے لائق ہوگیا منصور کا عامل جو مدینہ میں تھا گرفتار کرکے قید کر دیا گیا اور چند دنوں کے اندر سارے حجاز اور یمن نے محمد کو دنیائے اسلام کا خلیفہ مان لیا۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک نے محمد کی تائید میں فتویٰ دیا۔ منصور نے جب اس تحریک کو توقع سے زیادہ خطرناک پایا تو اپنی رسمی روباہ بازی سے کام لیا اور محمد نفس الزکیہ کو ایک خط لکھا اور اُن کو اجازت دی کہ جہاں جی میں آئے رہیں اسی کے ساتھ ایک بڑے وظیفہ کی لالچ دی اور ان کے رشتہ داروں کے حق میں بھی رعایت کا وعدہ کیا۔ محمد نے اس کا جواب دیا کہ آمرزش اور مہربانی کرنے کا حق تو ہم کو ہے، کیونکہ حقیقت

ے اعتبار سے خلافت میری چیز ہے"، اور امان کے متعلق یہ لکھا کہ اس کی حقیقت اسی امان کی سی تو نہیں جو و مسلم، عبد اللہ بن علی اور یزید بن ہبیرہ کو دی گئی تھی۔ منصور اس تلخ جواب سے جل گیا اور اس نے مد نفس الزکیہ کو ایک طویل خط لکھا۔ اور اس پر زور دیا کہ چونکہ آنحضرت صلعم نے کوئی اولاد ذکور نہیں چھوڑی س لئے آپ کی صاحبزادی کی اولاد کو وراثت نہیں پہونچتی، بلکہ اس کی حقدار آپ کے چچا عباس کی اولاد دی۔ منصور نے اپنے بھتیجہ عیسی کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کیا تاکہ وہ نفس الزکیہ کو کچل ڈالے۔ گ سے قبل محمد نفس الزکیہ نے اپنے رفقا سے کہا کہ جس کے جی میں آئے میرے ساتھ رہے، اور جو جانا ہے چلا جائے، اسپر آپ کے معاونین کی اکثریت نے اپنے اپنے گھر کا راستہ لیا اور آپ صرف تین سو دمیوں کے ساتھ منصور کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے رہگئے۔ آپ کے تمام ہیرو ایک ایک کرکے شہید وگئے اور ان کی لاشیں حسب دستور دار پر لٹکائی گئیں اہلبیت کی ایک خاتون نے عیسی سے اجازت لیکر قتولین کو مدینہ کے نزدیک "روضۃ الشہدا" میں دفن کر دیا۔

معیلیہ وادارسہ

عباسیہ نے فاطمیہ کو تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ وہ خراب و خستہ رہیں، لیکن فطرت اپنا اصول کب چھوڑتی ہے، جہاں تک ان کو ستایا جہاں تک انکی جمعیتیں پریشان کی گئیں، اتنا ہی لوگوں کے دل ان کے گرویدہ ہوتے گئے اور یہ بھی تاریخ کا عجیب و یب واقعہ ہے کہ اس پریشان حالی بے سروسامانی اور فلاکت کے باوجود فاطمیہ کی دو زبردست حکومتیں اسمعیلیہ ر ادارسہ قایم ہو ہی گئیں۔ حضرت امام حسین کی اولاد نے بہ استثنائے حضرت زید و یحیی کوئی ایسی سیاسی تحریک ں کی، پھر بھی حضرت اسمعیل ابن امام صادق کی اولاد نے مغرب میں جلالت و شکوہ کے وہ کارنامے چھوڑے دول اسلامیہ کی تاریخ میں ان کو ایک خاص امتیاز و اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، عبید اللہ المہدی سے طمیہ مصر کے آخری فرمانروا العاضد لدین اللہ (۲۹۷ھ - ۵۵۵ھ) تک ڈھائی سو صدیوں سے زیادہ رانہ ہوتا ہے، انھوں نے صقلیہ تک اپنی حکومت وسیع کی آل حسن نے عباسیہ کے لئے ایسی ایسی سیاسی نزاکتیں دا کردیں کہ منصور و رشید کے ہوش پراگندہ ہوگئے، محمد نفس الزکیہ اگر منصور ہی کی طرح سیاسی چالبازیوں سے خبر ہوتے تو آج اسلام کی تاریخ میں عباسیہ کی جگہ فاطمہ و علویہ ہی نظر آتے، اگر رشید حضرت یحیی کو دیلم سے بلاکر ہر نہ دلا دیتا تو وہ دیلم کے بادشاہ ہوچکے تھے، اور تاریخوں میں "صاحب الدیلم" ہی کے لقب سے مشہور ہیں۔ ضرت عبد اللہ محض ابن حسن مثنی ابن امام حسن ع کے چار صاحبزادوں محمد، ابراہیم، یحیی، ادریس نے ظلم و ستم ے اکتا کر ایسی ایسی تحریکیں کیں کہ عباسیہ خوفزدہ ہوگئے لیکن سیاسیات کے مکروفریب سے باخبر نہونے ، باعث ان کو ناکامیاں ہوئیں صرف ادریس کو خدا نے مغرب کا بادشاہ بنایا اور اس طور سے یہ دوسرا فاطمی

خاندان ہے، جس کو حکومت و سلطنت ملی۔ ۱٦۹ھ سے ۳۱۹ھ تک ان کی حکومت رہی، یحییٰ سوم کے زمانہ ۳۰۹ھ میں ادارسۂ مصر کا خاتمہ ہوگیا اس کے بعد ادریسی خاندان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قایم ہوئیں جن پر ۳۱۹ھ میں امویہ اندلس اور اسمٰعیلیہ متصرف ہوگئے۔

یحییٰ فرمانروائے دیلم

آپ صاحب الدیلم مشہور ہیں جیسا کہ مشہور نسابہ سید عمید الدین حسینی نے بیان کیا ہے، آپ حضرت امام حسن کے پوتے تھے، آپ کے والد کا نام عبد اللہ محض ابن حسن مثنیٰ بن امام حسن ہے، آپ خلیفہ رشید کے زمانہ میں بھاگ کر دیلم پہونچے وہاں کے باشندوں نے آپ سے بیعت کی اور اور آپ کے پاس جمع ہوگئے آپ کی شان و شوکت بڑھی، ہارون الرشید کو اس کا بڑا صدمہ و قلق ہوا اُس نے فضل ابن یحییٰ برمکی کو لکھا کہ یحییٰ نے میری آنکھوں میں کانٹے چبھوئے ہیں، جو وہ چاہیں اُن کو دو اور ان کی طرف سے میرا اندیشہ دور کردو، فضل بن یحییٰ ایک بڑا لشکر لیکر آ دھمکا اور خوف و لالچ مہر و قہر سے اُن کو پیام دیا، یحییٰ نے امان طلب کی فضل نے رشید کے وکیل کی حیثیت سے امان نامہ لکھدیا بعض روایت میں ہے کہ آپ دیلم میں غلامی کی حالت میں پہونچے وہاں کے باشندوں نے ایک لاکھ دینار میں آپ کو فضل سے خرید لیا حضرت یحییٰ مدینہ میں چلے گئے اس قیام مدینہ کے زمانہ میں عبد اللہ بن مصعب بن ثابت بن عبد اللہ زبیر رضی نے آپ کے خلاف رشید سے کہدیا کہ وہ مجھ سے بیعت لینا چاہتے تھے۔ رشید نے دونوں کو بلایا یحییٰ بھی مدینہ سے آئے جب آپ سے زبیری (عبد اللہ بن مصعب) کا سامنا ہوا تو اُس نے کہا "تم نے ہمارے خلاف سازش کی اور ہماری حکومت کی تباہی کا ارادہ کیا"۔

یحییٰ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تم کون ہو؟ رشید کو بے اختیار ہنسی آگئی یحییٰ نے کہا یا امیر المومنین یہ شخص جو آج ہم پر تہمت رکھ رہا ہے ہمارے بھائی نفس الزکیہ کے ساتھ آپ کے جد منصور کے خلاف خروج میں شامل تھا اور یہ اسی نے کہا ہے"

ان الخلافۃ فیکم یا بنی حسن — قوموا ببیعتکم ننھض بطاعتنا

(ترجمہ) اے آل حسن! اپنی بیعت کیلئے اُٹھ کھڑے ہو، ہم تمھاری فرمانبرداری کیلئے مستعد ہیں خلافت تمھاری چیز ہے اور اے امیر المومنین یہ شخص جو تہمت رکھ رہا ہے وہ آپ کی محبت اور آپ کی حکومت کے ساتھ ہمدردی رکھنے کا نتیجہ نہیں بلکہ ہم تمام اہل بیت کے ساتھ عناد پروری کا مظاہرہ ہے، میں حلف اُٹھانے کو کہتا ہوں اگر وہ حلف اُٹھا لیگا کہ میں نے اس سے بیعت کے لئے کہا تھا تو پھر میرا خون آپ کے لئے حلال ہوگا"۔

جب عبد اللہ نے جھوٹا حلف لیا تو، یحییٰ نے کہا یا امیر المومنین مجھے تین دن تک حوالات میں رکھئے۔ اگر عبد اللہ پر کوئی بلا نازل نہ ہو تو میرا خون حلال ہے، رشید نے یحییٰ کو فضل برمکی کے سپرد کیا فضل روایت

کرتے ہیں کہ اللہ کی قسم ہم نے ابھی اس دن عصر کی نماز بھی نہ پڑھی تھی کہ عبد اللہ بن مصعب کے گھر سے چیخنے کی آواز آئی، ہینے دریافت حال کے لئے آدمی بھیجے معلوم ہوا کہ وہ جذام کے مرض میں مبتلا ہو گیا - میں اس کے یہاں گیا لیکن میں نے اس کو نہیں پہچانا، وہ سیاہ کوئلہ کے مثل ہو گیا تھا[1] - میں رشید کے پاس گیا تاکہ اس کو خبر دوں ابھی میں نے بات بھی پوری نہیں کی تھی کہ اس کی موت کی خبر آئی - مگر رشید کا ظلم تو دیکھئے کہ وہ اس پر بھی باز نہ آیا اُس نے امان نامہ پھاڑ ڈالا، اور یحیٰی کو جیلخانہ میں بھیجدیا، چند دن گزرنے کے بعد قاضی اور اہل دربار جمع ہوئے سبھوں نے کہا کہ امان نامہ صحیح ہے" اس میں کوئی خرابی نہیں، یحیٰی خموش تھے حاضرین میں سے کسی نے کہا آپ چپ کیوں ہیں؟

آپ نے اپنے منھ کی طرف اشارہ کیا کہ مجھ میں بولنے کی طاقت نہیں اور اپنی زبان نکالی آپ کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا رشید نے کہا یہ تم کو وہم دلا رہے ہیں کہ ان کو زہر دیا گیا ہے، پھر آپ کو جیلخانہ میں واپس کر دیا اس کے بعد آپ کی کوئی خبر نہ ملی،

آپ کے واقعۂ شہادت کے متعلق مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں ایک روایت تو یہ ہے، کہ ایک حوض میں بھوکے شیروں کے سامنے چھوڑ دیا گیا اور وہ آپ کو نوچ کر کھا گئے - دوسری روایت یہ ہے کہ سندی ابن شاہک کے گھر میں ایک کمرہ کے اندر بند کر دیا اور اس کو مٹی وغیرہ سے بھر دیا -

ابو الحسین ابن علی عابد آپ حضرت حسن مثلث ابن حسن مثنیٰ ابن امام حسنؑ کی اولاد میں تھے، آپ نے خلیفہ ہادی ابن مہدی عباسی کے زمانہ میں علویہ کی ایک جماعت کے ساتھ مکہ میں خروج کیا محمد ابن علی ابن عیسیٰ اور محمد ابن سلیمان بن منصور نے بمقام فخ ۱۶۹ھ میں آپ کو جام شہادت پلایا اور آپ کی گردن مبارک کاٹ کر خلیفہ ہادی کے دربار میں بھیجی، ہادی کو اُن کی یہ حرکت پسند نہ آئی امام محمد تقی ابن امام علی رضا فرمایا کرتے تھے کہ کربلا کے بعد سب سے بڑی مصیبت واقعۂ فخ" ہے جو ہم لوگوں پر گزری -

عبد المالک (آروی)

(نگار) ہمارے عزیز دوست مولوی عبد المالک آروی نے جس سوز و درد کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، اُس سے کس کو ہمدردی نہ ہوگی، لیکن سوال یہ ہے کہ امویہ و عباسیہ کی تمام سختیاں

---

[1] (نگار) حیرت ہے کہ یحیٰی کے خلاف جھوٹی قسم کھانے پر ایک شخص تو مبتلائے جذام ہو جائے، لیکن خدا ان لوگوں کو چھوڑ دے جو واقعی ظلم و ستم کے بانی تھے - اس نوع کی روایات ماننے میں مجھے بہت تامل ہے - نیاز

علوئین کے خلاف کیوں تھیں؟ کیا اس لئے تھیں کہ وہ آل رسول و معاوین آل رسول تھے؟ کیا محض اس وجہ سے تھیں کہ بانی اسلام کا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا تھا؟ نہیں، بلکہ یہ مخالفت صرف اس لئے تھی کہ وہ ڈرتے تھے کہیں اُن کی حکومت نہ چھن جائے اور علوئین اُن کی سلطنت پر قابض نہ ہو جائیں۔ پھر جب یہ امر مسلم ہے کہ عہد خلافت کے بعد، امیر معاویہ کے عہد سے اسلام میں خالص دنیاوی حکومت شروع ہو گئی تھی اور بنی امیہ و بنی عباس میں جن جن کو خلفاء کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے وہ سب کے سب اُنھیں اصول سیاست کے ماتحت اپنی حکومتوں کو قائم رکھنا چاہتے تھے، جو دنیا کے حکمرانوں نے ہمیشہ اختیار کئے ہیں، تو پھر اُن کے مظالم کا شکوہ کیوں کیا جائے؟

اگر تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ امویہ وعباسیہ نے علوئین پر ظلم کئے تو یہ بھی ثابت ہے کہ علوئین نے ہمیشہ در پردہ اپنی کوششوں کو جاری رکھا اور بارہا امویہ وعباسیہ کے خلاف خروج بھی کیا۔ اس لئے اگر امویہ وعباسیہ نے اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا جو دنیا کے ارباب حکومت نے ـــــ اپنی سلطنت کے تحفظ کے لئے ہمیشہ کیا ہے اور ہمیشہ کریں گے تو کیا الزام ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر امویہ وعباسیہ اس قدر سختیاں نہ کرتے، اتنی احتیاط سے کام نہ لیتے تو علوئین کا برسر اقتدار ہو کر حکمراں ہو جانا یقینی تھا اور امویہ وعباسیہ اُسے کس طرح گوارا کر سکتے تھے۔ اگر وہ سمجھتے کہ آل رسول واقعی مستحق خلافت ہیں اور حکومت و سلطنت اُنھیں کو ملنا چاہئے تو یہ جھگڑا بڑھتا ہی کیوں۔ الغرض تمام دنیاوی حکومتوں کے قیام کی تاریخ اسی طرح کی خونیں داستانوں سے معمور ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر علوئین برسر حکومت ہوتے تو امویہ وعباسیہ کے ساتھ وہ کوئی دوسرا سلوک کرتے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ امویہ وعباسیہ اگر واقعی مسلمان ہوتے تو آل رسول کے ساتھ اس قدر بدتمیزی کا سلوک کبھی نہ گوارا کرتے اس پر دونوں جانب سے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور اس قسم کے مباحث کو چھیڑنا اب بالکل بیکار ہے جبکہ مسلمانوں سے خلافت و حکومت دونوں چیزیں چھین لی گئی ہیں اور علوئین وغیر علوئین سب کے لئے یہ "باب نزاع" الحمد للہ ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا ہے۔

یہ وقت اس بحث کا نہیں کہ اس سے قبل ہم پر کیا گزر گیا، بلکہ یہ دیکھنے کا ہے کہ آئندہ ہم پر کیا گزرنے والا ہے۔ یعنی اب ضرورت گزشتہ اختلافات کے دہرانے کی نہیں ہے بلکہ آئندہ کسی ایک امر پر متفق و متحد کر دینے کی ہے۔ وللہ در ما قال

بحث و جدل بجائے ماں، میکدہ جوی کاندراں ۔۔۔ کس نفس از جمل نزد، کس سخن از فدک نہ راند

(نیاز)

ناموس خاندان

(تمثیل)

سین ــــ قاضی صاحب ایک قدیم وضع کے زمیندار کی میلی کچیلی بیٹھک جسمیں برائے نام سامان آرائش ہے کمرے کے کچے فرش پر کئی جگہ سے پھٹی ہوئی ایک کثیف دری بچھی ہے۔ کھڑکیاں ندارد ہیں صرف ایک روشن دان اور دو دروازے ہیں۔ ایک دروازہ سڑک کی جانب ہے دوسرا زنانہ مکان میں کھلتا ہے۔ زنانہ مکان کے دروازے پر ٹاٹ کا ایک موٹا پردہ پڑا ہے۔ داخلہ کے دروازہ کے بالکل مقابل، کمرے کے وسط میں دیوار سے متصل ایک تخت ہے جس پر پھٹا پرانا فرش بچھا ہے۔ اسی فرش پر ایک پیرانہ سال قاضی جی مع اپنی ریش دراز کے جلوہ افروز ہیں سفید ململ کا قدرے کثیف کرتا اور ڈھیلے ڈھالے پائچوں کا پائجامہ زیب بدن ہے۔ داہنی جانب تہہ کی ہوئی جانماز اور قریب ہی تپائی پر لوٹا رکھا ہے۔ بائیں طرف ایک پرانے خاصدان کے پاس کچھ کتابوں کا ڈھیر ہے۔ تخت پر قاضی صاحب کے بالکل سامنے حقہ رکھا ہے۔ بائیں طرف کی دیوار سے ملی ایک چارپائی ہے جس پر ایک جانب تہہ کئے ہوئے بچھونے کا پلندہ رکھا ہے۔ تخت کی داہنی طرف دو تین شکستہ حال کرسیاں جن کے ہتھے ٹوٹ گئے ہیں پڑی ہوئی ہیں۔ قاضی صاحب اکیلے بیٹھے ایک کتاب کا مطالعہ فرما رہے ہیں۔ حقہ کی نے منھ سے لگی ہوئی ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک آدھ کش لگا لیتے ہیں۔ ٹھیک جس وقت قاضی صاحب کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہوتے ہیں۔ پردے کے پیچھے سے دو آنکھیں جھانکتی ہوئی نظر آتی ہیں پھر ایک بار آواز سنائی دیتی ہے:۔ "اے تم اکیلے ہی بیٹھے ہو نا؟" قاضی صاحب چونک کر گردن اٹھاتے ہیں "اچھا۔ تم ہو بی" ــــ جواب ملتا ہے "ہاں۔ کہو تو ذرا کی ذرا چلی آؤں۔ کچھ کہنا ہے"۔ قاضی صاحب سلیپر پہن کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہتے ہیں:۔ "ٹھہرو۔ ذرا دروازہ بند کر لوں"۔ دروازہ بند کر کے اپنی جگہ پر واپس آتے ہیں۔

قاضی صاحب ۔ لے اب چلی آؤ۔

(تیس اور چالیس سال کی درمیانی عمر کی ایک عورت، چوڑی دار پائجامہ اور کرتا پہنے، گلابی رنگ کا دوپٹہ جس میں سستے قسم کی لیس ٹکی ہے اوڑھے، آکر تخت کے کونے پر بیٹھ جاتی ہے، ہاتھ میں ایک تھالی لئے ہے جس میں پان کے دو تین بیڑے،

چھالیا اور سروتا رکھا ہے ۔بقالی تخت پر رکھدیتی ہے)

قاضی صاحب :۔ کہو کیا ہے ۔بی ۔ (پان کا ایک بیڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیتے ہیں)

بی :۔ اے کچھ نہیں ۔نجمہ کے کپڑوں کے بارے میں کہنے آئی تھی ۔

قاضی صاحب :۔ نجمہ کے کپڑے ؟

بی :۔ ہاں ۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے ۔ دس بارہ دن میں رحمت کا بیاہ ہونے والا ہے نا ۔ آخر لڑکی کے لئے کچھ کپڑے درکار ہوں گے کہ نہیں ۔ بچاری کے پاس ایک تار نہیں ہے (ٹھنڈی سانس بھرتی ہے) ہا ! غریب کے لئے میرا دل کیسا کیسا کڑھتا ہے ! ——— (کچھ توقف کے بعد) خیر گہنے پاتے کا تو کچھ نہ کچھ انتظام ہو ہی جائیگا ۔ مانگے کی دو چار چیزوں کا کہیں سے بندوبست ہو جائیگا ۔ اب رہے کپڑے ———

قاضی :۔ تو پھر کہیں سے مانگے کے کپڑوں کا بھی بندوبست کر لو ۔

بی :۔ مانگے کے کپڑے ! اے ہٹو بھی ۔ کیسی باتیں کرتے ہو ؟ بھلا سوچو تو برادری کیا کہے گی ؟

قاضی صاحب :۔ (مسکراتے ہوئے) اور برادری زیور کے بارے میں کچھ نہ کہے گی ؟

بی :۔ زیور ۔ زیور کا معاملہ دوسرا ہے ۔ آج کل سبھی مانگے تانگے کے زیور سے کام چلاتے ہیں ۔ ابھی اس دن کی بات ہے مولوی رحمن کی دلھن خانصاحب کی بڑی بہو کا جھومر اور گلوبند پہنے تھیں ۔ میں نے دیکھتے ہی تو پہچان لیا میں بولی "اے ہے سارہ کیسا پیارا گلوبند ہے !" بس سارہ کا تو جیسے خون خشک ہو گیا ہو ۔ مگر ان کی ساس بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھیں ۔ بڑھیا ڈھڈو ۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت ۔ قبر میں پاؤں لٹکائے تو بیٹھی ہیں لیکن اب تک شوخ رنگ کے کپڑے پہننے کا ارمان نہ گیا ۔ جب دیکھو پوپلے منہ میں پان ٹھنسا ہوا ہے ۔ منمناتی ہوئی آواز میں بولیں "تمھیں بھی پسند آیا ۔ اے یہ نگوڑا گلوبند ہے ہی ایسا ۔ جس نے دیکھا پسند کیا ۔ اچھا ہے نا ؟" میں نے کہا بیشک بڑا خوبصورت ہے ۔ اور دیکھنا خانصاحب کی دلھن کے گلوبند سے کتنا ملتا جلتا ہے ۔ جیسے ایک ہی کاریگر کے ہاتھ کا بنا ہوا ہو ۔ رتی برابر بھی تو فرق نہیں " بس میرا یہ کہنا تھا کہ بڑھیا پیک کی پچکاری مار گول گول دیدے بنا کے کہتی کیا ہے "کہاں خاں صاحب کی دلھن کا گلوبند کہاں یہ ۔ ہٹو بھی بہن ۔ کیسی باتیں کرتی ہو ۔ ہوش کے ناخن لو ۔ ابھی پرسوں تو سارہ کا دولھا اس کے لئے لکھنؤ سے یہ گلوبند مول لایا ہے "———

اللہ اکبر ! ذرا یہ دیدہ دلیری کا سفید جھوٹ تو دیکھو ۔ میں بولی "بہن خیر ۔ خدا کا شکر ہے ۔ چلو داماد دکھانے کے تو قابل ہوا ۔ مبارک ہو " پھر اس پر طرہ یہ کہ ....

قاضی جی :۔ (بات کاٹتے ہوئے) اچھا ۔ اچھا ۔ ہوگا ۔ اب یہ بتاؤ کہ نجمہ کے کپڑوں کے بارے میں کیا طے کیا کتنی لاگت آئے گی ؟

ں :- اب میں کیا جانوں - منا لال بزاز کو کھڑے کھڑے بلوا لیتے - وہ حساب کر کے بتا دے گا -

اضی صاحب :- لیکن آخر تم نے بھی تو کچھ اندازہ لگایا ہو گا -

ں :- اچھا ٹھہرو - بتاتی ہوں (قدرے توقف کے بعد) اب تم یوں سمجھو کہ کم سے کم دو جوڑے تو چاہئے
ی ہوں گے -

اضی صاحب :- دو جوڑے کیسے ؟ ایک سے کام نہیں چل سکتا -

ں :- تم بھی کیسے بھولے ہو - جانتے ہو کہ لڑکی رات کی رات مہمان رہے گی - آخر دوسرے دن جوڑا
لنا چاہئے کہ نہیں ؟ —— کیا تمھارا مطلب ہے بچاری دو دن تک وہی جوڑا پہنے رہے !

اضی صاحب :- (سٹپٹا کر) لیکن اس میں ہرج ہی کیا ہے ؟

ں :- ہرج ! میں کہتی ہوں لوگ کیا کہیں گے - دیکھ لینا ہر طرف تھڑی تھڑی ہو گی - مہمان ایک دوسرے
ے کانا پھوسی کریں گے " اے دیکھنا بہن قاضی صاحب کی دلھن کے پاس بس یہی ایک جوڑا ہے - کل شام کو
ی اسی کو پہنے ہوئے تھیں - آج پھر وہی ڈانٹے ہیں —— اور پھر یہ لوگ اپنے کو رئیس اور نواب کہتے ہیں "
نہ، مجھ سے نہ ہو گا کہ میں چپکی بیٹھی یہ طعنے سنا کروں - یہ بڑا عزت آبرو کا معاملہ ہے میں اپنی بچی کو کپڑے لتے سے
راستہ کئے بغیر ہرگز تو برات میں جانے نہ دوں گی - واہ ....

اضی صاحب :- لیکن بی - تم جانتی ہو آج کل خرچ کی کیسی تنگی ہے -

ں :- خرچ - خرچ کی تو ہمیشہ ہی تنگی رہتی ہے - کوئی نئی بات ہے —— مگر ....

اضی صاحب :- مگر کیا ؟ -

ں :- مگر یہ کیا کیا مہاجن سے کچھ روپیہ قرض نہیں لیا جا سکتا - اب ایسا بھی کیا اندھیر ہے کہ ایک چھوٹی
ی رقم کے لئے وہ انکار کر دے -

اضی صاحب :- لیکن تم نے یہ نہ بتایا کہ آخر کپڑوں میں خرچ کتنا ہو گا -

ں :- ٹھہرو - مجھے سوچنے دو (سوچتی ہے اور انگلیوں پر کچھ حساب لگاتی ہے) بس یہ سمجھو کہ کوئی دو سو
پئے درکار ہوں گے -

اضی صاحب :- (تعجب کے لہجے میں) دو سو !!!

ں :- ہاں دو سو - بات یہ ہے کہ گھر میں پہننے کے کپڑوں سے تو بہر حال یہ جوڑے اچھے ہونا ہی چاہئے - اسی
ے دام بھی زیادہ لگیں گے - لڑکی انھیں کوئی روز روز تھوڑی پہنے گی - وہ تو شادی بیاہ کے موقعوں کیلئے
ں گے ——

قاضی جی :۔ (تعجب کے لہجے میں دوبارہ) دوسو بی !!

بی :۔ دوسو سے تو کم میں کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ آخر کچھ اپنی حیثیت کا، خاندان کے ناموس کا بھی تو خیال کرو۔ اور روپیہ کا کیا ہے؟ روپیہ تو ہاتھ کا میل ٹھہرا۔ ادھر آیا اُدھر خرچ ہوا۔ بڑی چیز عزت آبرو کا پاس ہے۔ اُس سے کیا فائدہ کہ لوگ طعنے دیں کہ "ہاں بہن۔ بیاہ تو بڑے دھوم دھڑکے سے رچایا لیکن اب دلہن کی گت دیکھو۔ بدن پر چیتھڑا تک نہیں"

قاضی صاحب :۔ (مری ہوئی آواز میں) تمھیں معلوم ہے بی۔ وہ جو اس بیاہ کے لئے میں نے دس ہزار کی رقم قرض لی تھی اب قریب قریب دگنی ہوگئی ہے۔ اور اصل تو درکنار اب تک سود تک ادا کرنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔

بی :۔ روپیہ! روپیہ —— خدا کی مار اس موئے روپے پر۔ جب دیکھو روپے کی پکار مچی ہوئی ہے۔ روپیہ کوئی ہمارے ساتھ عاقبت میں تو بخشوانے جائیگا نہیں؟ —— تو پھر بولو کیا کہتے ہو۔

قاضی صاحب :۔ (اکتا کر) اچھی بات ہے بی۔ سوچ کر بتاؤں گا۔

بی :۔ سوچ کر بتاؤ گے؟ —— یہ خوب کہی۔ میں نہیں جانتی۔ اسی اٹھوارے میں کپڑے سل کر تیار ہو جائیں سمجھے کہ نہیں —— آخر منالال بزاز کو کیوں نہیں بلوا بھیجتے'

قاضی صاحب :۔ منالال بزاز کو کس منہ سے بلوا بھیجوں۔ ابھی ابھی تو اُس نے حساب بھیجا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں کہ بغیر پچھلا روپیہ بیباق ہوئے وہ کپڑا دینے کو تیار ہو جائے۔ خیال تو کرو کتنے دنوں سے رقم چڑھی ہوئی ہے کہاں تک صبر کرے بے چارہ؟

بی :۔ (زبان کا بیڑا کلے میں دبائے ہوئے) جو کچھ بھی ہو فصلانہ کی وصولیابی تک تو اُسے انتظار کرنا ہی پڑیگا

قاضی صاحب :۔ فصلانہ؟

بی :۔ ہاں فصلانہ کی وصولی میں اب دن ہی کتنے باقی ہیں۔ دس بارہ روز میں وصول ہو جائیگا۔ سوچتی ہوں فصلانہ ملتے ہی نجمہ کے گلوبند مہاجن کے یہاں چھڑوا لوں۔ کب سے گروی پڑا سڑ رہا ہے۔

قاضی صاحب :۔ مگر بی۔ فصلانہ تو جو کچھ وصول ہوگا سرکاری مالگذاری میں چلا جائیگا۔

بی :۔ سرکاری مالگذاری!

قاضی صاحب :۔ ہاں مالگذاری تھوڑی روکی جا سکتی ہے۔ مہاجن اور بزاز کو تو خیر ٹالا بھی جا سکتا ہے لیکن سرکاری مالگذاری کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ کسی طرح نہیں ٹل سکتی۔

بی :۔ (یکایک رو پڑتی ہے) میں سمجھ گئی۔ تم مجھے الو بناتے ہو —— یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں۔......

(بی ہچکیاں لے لے کر رونے لگتی ہے۔ قاضی صاحب ہکا بکا ہو کر بیوقوفوں کی طرح چاروں طرف دیکھتے ہیں)

وں اوں ـــــــ دنیا جہان کی بہو بیٹیاں (ہچکی) کیسے اچھے اچھے (ہچکی) ـــــــ کیسے اچھے اچھے (ہچکی)
ے پہنتی اوڑھتی ہیں (ہچکی) ـــــــ گہنے پاتے سے (ہچکی) گو ندنی کی طرح لدی رہتی ہیں ـــــــ اور
ر میری بچی (ہچکی) موئے کنگالوں کی طرح چیتھڑے لگائے ...... (ہچکی) کیسی ذلت کی بات ہے!!
ضی صاحب :- ہائیں - ہائیں بی ـــــــ سنو تو ـــــــ ارے بھئی (کھڑے ہوکر) اچھا میں ابھی بزاز کو
وائے دیتا ہوں -

ی :- (آنسو خشک کرتے ہوئے) تو پھر جلدی کرو -

اضی :- اور تم ! آخر تمھیں بھی تو کپڑے چاہئے ہیں -

ی :- اوںھ - میرا کیا ہے ؟ تم میری فکر نہ کرو -

اضی :- لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ کپڑے تو تمھیں بھی درکار ہوں گے -

ی :- نہیں جی - میرا کیا ہے - لشتم پشتم جو کچھ ملیگا پہن لوں گی ـــــــ مگر میری بچی کو اچھی طرح حیثیت
کے موافق پہن اوڑھ کر جانا چاہئے -

(اندر سے ایک آواز سنائی دیتی ہے)

آواز :- اماں - اماں

بی :- کون ؟ ـــــــ جعفر - مدرسہ میں آج جلدی چھٹی ہو گئی کیا ؟

(اٹھارہ سال کا ایک الول جلول لڑکا، بدوضع کپڑے پہنے، ہونقوں کی صورت بنائے داخل ہوتا ہے)

بی :- (جعفر کے اترے ہوئے چہرے اور آنسو بھری آنکھوں کو دیکھکر) خیریت تو ہے جعفر ؟ ـــــــ بیٹا تم
اداس کیوں ہو ؟ ـــــــ

جعفر :- اماں - فیس

قاضی :- فیس ؟

جعفر :- جی ہاں - آج داخل ہو جانا چاہئے - نہیں تو - نام کٹ جائے گا - اور ماسٹر صاحب کہتے تھے امتحان
میں بیٹھنے کی اجازت بھی نہیں ملے گی -

بی :- (جعفر کے پاس آکر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) ـــــــ میرا بچہ ! میرا بچہ ـــــــ یہ ماسٹر گوڑی
یونہی روز روز میرے لال کے پیچھے پڑے رہتے ہیں ـــــــ ابھی اسی روز بچارے کے پاس کوئی کتاب
نہیں تھی، یا جانے کیا تو درجے میں بیٹھنے بھی نہ دیتے تھے -

جعفر :- ہاں اماں - خوب یاد دلایا - قواعد کی کتاب آج ہی مل جائے - نہیں تو انگریزی کے ماسٹر صاحب

مدرسہ کے پاس نہیں پھٹکنے دیں گے۔

قاضی :۔ خدا غارت کرے ان ماسٹروں کو! کتابیں ــــ کاپیاں ــــ فیس ــــ روز ہی رونا - روز ہی چیخ پکار! آخر ہم نے بھی تو پڑھا ہے - ہم نے تو اتنی عمر میں کبھی نہ اتنی کتابیں خریدیں نہ ڈھیر کی ڈھیر کاپیاں مول لیں - تختیوں سے خاصہ کام چل جاتا تھا ــــ یہ انگریزی تعلیم تو ہمارا دیوالہ نکالے دیتی ہے۔

بی :۔ اور پھر کتابیں بھی کیسی ــــ کیڑوں مکوڑوں جیسے مہین مہین حرفوں سے لپی ہوئی - میں تو جعفر سے کہا کرتی ہوں کہ بچے یہ کتابیں پڑھ پڑھ کے ایک دن تو اپنی آنکھیں پھوڑ لے گا۔

جعفر :۔ (تھوڑے توقف کے بعد) - اماں فیس -

قاضی صاحب :۔ (جھنجھلا کر کھڑے ہو جاتے ہیں) میں کہتا ہوں تمھارے ماسٹر صاحب دو چار دن صبر نہیں کر سکتے - کوئی فیس لیکر بھاگا نہیں جا رہا ہے - !

جعفر :۔ لیکن یہ رقم کوئی ان کی جیب میں تو جائیگی نہیں - آپ تو جانتے ہیں کہ ....

قاضی :۔ اچھا کل کتنی فیس ہوئی ؟

جعفر :۔ پچیس روپئے -

قاضی :۔ پچیس روپئے ؟ خدا کی پناہ ! .... پچیس روپئے !!

جعفر :۔ ہاں ابا -

قاضی :۔ پچیس روپئے - جاؤ بیٹا - اپنے ماسٹر صاحب سے کہدینا کہ وہ مجھے اس طرح الّو بنا کر نہیں لوٹ سکتے

جعفر :۔ (متعجب ہو کر) مگر ابا یہ تو میرے امتحان کی اور پڑھائی کی فیس ہے -

قاضی :۔ (غضبناک ہو کر) بلا سے - ہوگی امتحان کی فیس ــــ مجھے تمھارا انگریزی مدرسہ میں پڑھنا کبھی پھوٹی آنکھ نہ بھایا ــــ لڑکوں کو اچھا خاصہ کرسٹان بنا دیتے ہیں - جہاں شد بد پڑھ لیا بن اڑھی منڈا، فرنگیوں جیسے کپڑے پہن لگے اِدھر اُدھر اینڈنے -

بی :۔ اے ہاں - ٹھیک تو کہتے ہو - دور کیوں جاؤ لے اب سجادہی کو دیکھ لونا - پکا کرسٹان بنا پھرتا ہے - روزہ رکھنا اس کے نزدیک فاقہ کرنے کے برابر ہے - نماز پڑھنے کو تو یہ توبہ نعوذ باللہ ٹکریں مارنے کے برابر سمجھتا ہے - داڑھی مونچھ غائب - موئے فرنگیوں کی طرح چوکی کے بدلے پاٹ پر بیٹھتا ہے ــــ نا بابا! میں باز آئی اپنے بچے کو ایسے مدرسے میں بھیجنے سے !

جعفر :۔ لیکن اماں - آپ کو معلوم ہے مجھے پڑھنے کا کتنا شوق ہے -

ں :۔ میرے لال اس پڑھائی سے میں پوچھتی ہوں، آخر فائدہ کیا۔ کوئی لاٹ گورنر تو بن نہیں جاؤ گے؟.....
.... رہا پڑھنے کا شوق۔ سو تمھارے ابا کے پاس ایک چھوڑ نہ جانے کتنی کتابیں بھری پڑی
یں جب جی چاہے پڑھو۔ کوئی منع کرتا ہے؟
جعفر:۔ اماں آپ تو سمجھتی نہیں — یہ کتابیں میرے کس کام کی عربی فارسی کی کتابیں۔
اضی:۔ (غصہ میں) کیا کہا؟ پھر تو کہنا یہ کتابیں کس کام کی ————
———— ہاں بھلا یہ کتابیں جن میں خدا رسول کی باتیں لکھی ہوں، جنھیں پڑھنے سے عاقبت درست ہو۔ تیرے
س کام کی!!
جعفر:۔ مگر ابا۔ اب آج کل تو ان کتابوں کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگاتا ———— اور میں کہتا ہوں آخر ایسی کتابوں
کے پڑھنے سے فائدہ ہی کیا؟ سوا اس کے کہ انھیں پڑھ پڑھ کے آدمی اچھا خاصا "ملانٹا" بن جائے سو مجھے
و ملا بننے سے چڑھ ہے۔
اضی:۔ (اٹھ کھڑے ہو کر جعفر کی طرف بڑھتے ہوئے) چپ رہ۔ نالائق! میرے سامنے ایسی واہیات
باتیں! پاجی کہیں کا۔ دور ہو جا میرے سامنے سے ———— دیکھی ہو اس پاجی کی بدتمیزی۔ یہ انگریزی
تعلیم کا اثر ہے۔ نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ۔ بس خدا رسول کا مضحکہ اڑانے کو دیدو.......
ٹھہر تو جا مردود! ابھی مزہ چکھاتا ہوں اس گستاخی کا (قاضی صاحب دانت پیستے ہوئے جعفر کی طرف بڑھتے
ہیں۔ بی ان کا ہاتھ تھام لیتی ہے)
بی:۔ جعفر کے ابا! جانے دو۔ چلو ہوگا۔ بچہ تو......
قاضی:۔ بچہ ہے؟ انیسواں سال لگ گیا اور ابھی ———— بچہ ہی ہے ———— لچا لفنگا کہیں کا نکل یہاں سے مردود!
بی:۔ اے یہ تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ لے بس اب غصہ تھوک دو۔ چلو کھانا کھائیں جعفر غریب بھوکا ہوگا۔
کندن! اری او کندن!........
کندن:۔ اچھا بی۔ آئی۔
بی:۔ کندن۔ کھانا تیار ہوا؟
کندن:۔ بی للو ابھی بنیے کے ہاں سے پلٹا ہے موئے نے سودا وودا کچھ بھی نہیں دیا کہلوا بھیجا ہے
کہ جب تک پچھلا حساب چکایا نہ جائیگا میں ایک دانہ نہیں دینے کا۔
بی اور قاضی صاحب:۔ (ہم آواز ہو کر) یہ کیا؟ ———— اس کے کیا معنے ہیں؟!!
جعفر:۔ خدایا روز یہی رونا رہتا ہے ———— مجھ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ میں نہیں برداشت کر سکتا آج

پیسہ کی تنگی ہے، کل روٹی کی محتاجی ہے ——— میں نکل جاؤنگا - مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالوں گا
قاضی :- کیا بکتا ہے بے ہودہ ! تجھ سے بیچ میں ٹانگ اڑانے کو کس نے کہا تھا -
جعفر :- ابا - آپ ہی بتائیے - آخر کب تک اس طرح کام چلے گا - اس مصیبت کا کوئی علاج تو ہمیں سوچنا ہی پڑے گا -

قاضی :- بس بس خاموش رہ - نہیں تو ایسا ٹھیک کروں گا کہ یاد کرے گا -

جعفر :- ابا - مجھ سے نہیں دیکھا جاتا - مفلسی اور ناداری کی یہ زندگی نہیں دیکھی جاتی ——— یہ پیسہ پیسہ کی محتاجی ! آہ کس قدر ذلت کی بات ہے - ہم سے ایک معمولی مزدور ابھی اچھا ہوگا - دن بھر محنت مشقت کرکے ایڑی چوٹی کا پسینہ ایک کیا - شام کو مٹھی بھر پیسے ملے - بس مگن ہوگیا - آہ کیسا اطمینان کتنی آزادی ! - اور ہم ؟ ہم جو رئیس اور نواب کہلاتے ہیں - شریف بنے اینڈتے پھرتے ہیں - ذرا خیال تو کیجئے ہم لوگوں نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے .... ہم فاقے کرتے ہیں بھوکوں مرتے ہیں لیکن کیا مجال جو ہاتھ پاؤں ہلائیں کوئی کام کاج کریں ——— ہم کتوں سے بھی بدتر زندگی بسر کرتے ہیں - ہمارا وجود ایک آسمانی بلا ہے ایک ہولناک عذاب !! ....

قاضی صاحب :- ابے چپ رہتا ہے کہ نہیں -

بی :- (قاضی صاحب اور جعفر کے درمیان بیچ بچاؤ کرتے ہوئے) جعفر کے ابا ...... اجی جعفر کے ابا —
جعفر :- نہیں - ہرگز نہیں چپ ہونگا - بولے جاؤنگا - خوب چیخونگا - دل کی بھڑاس نکالے بغیر زبان نہیں روکوں گا اب مجھ میں ضبط کی قوت باقی نہیں - چپکا بیٹھا اس ذلت آمیز مفلسی کا تماشا نہیں دیکھ سکتا .... اماں کے یہ میلے کچیلے چیتھڑے، یہ کثیف گدڑی دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے کلیجے پر گھونسہ ماردیا ہو .... جب دیکھو خرچ کی تنگی ہے - جب سنو بنئے کے یہاں سے ادھار آرہا ہے مہاجن کا سود چڑھتا جاتا ہے ——— اور یہ ظالم بنئے اور مہاجن - انسانی جونکیں ! یہ ہم لوگوں کے خون کا آخری قطرہ تک چوس کر چھوڑیں گے ... آخر کب تک صبر کروں ؟ کب تک یہ اذیتیں سہوں ؟— نہیں نہیں ایک منٹ کے لئے نہیں ٹھہر سکتا - جہاں سینگ سمائیں گے نکل جاؤنگا اور مزدوری کرکے پیٹ پالونگا ———

بی :- (جلدی سے جعفر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے) ہائیں جعفر ! کیا بکتے ہو ؟ مزدوری کروگے ؟ باپ دادا کی عزت پر بٹہ لگاؤگے ؟ خاندان کا نام ڈبوؤگے ؟

جعفر :- باپ دادا کی عزت ! خاندان کا نام ! .... سب وہم ہے - سب دھوکہ ہے - کیسا ننگ ناموس ؟

اور کہاں کی عزت !! جب ہمارے پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا ہی نہ ہوگا تو کیا خاندان کے نام کو شہد لگا کر چاٹیں گے۔؟ ——————

یہ جھوٹی شیخی ایک مہیب بلا ہے جو ہمیں نگلے جا رہی ہے۔ یہ مصنوعی ننگ و نام ایک مہلک پھوڑا ہے جو اندر ہی اندر ہماری ہڈیاں تک گھلائے دے رہا ہے !!

قاضی صاحب :- لونڈے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

جعفر :- دماغ خراب نہیں ہوا، درست ہو گیا ہے۔ پہلے میں پاگل تھا۔ اب جنون کا سودا سر سے اترا ہے اب ہوش آیا ہے، آنکھیں کھلی ہیں، جیسے کوئی ہولناک خواب دیکھتے دیکھتے یکایک بیدار ہو جائے ——

یہ ہم پر خدا کا قہر نازل ہو رہا ہے۔ باپ دادا کی نام نہاد شرافت ہمیں زہریلی ناگن بن کر ڈس رہی ہے۔ آہ افسوس ! افسوس! .... ننگ و ناموس ! عزت آبرو۔ سب خیال، سب وہم !!! —— ذرا آنکھیں اٹھا کر اماں جان کی طرف دیکھئے۔ ان کے چیتھڑوں پر نظر ڈالئے — ننگ و ناموس اسی چیز کا نام ہے ؟ عزت اور شرافت اسی کو کہتے ہیں ؟ ....

اچھا رخصت۔ اس ذلیل زندگی کو ہمیشہ کے لئے خدا حافظ !

(جعفر دروازہ کی طرف بڑھتا ہے۔ بی دونوں ہاتھ پھیلائے وحشتناک صورت بنائے اسکے پیچھے پیچھے لپکتی ہیں)

بی :- میرا بچہ ! میرا لال ....

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

اسد اللہ کاظمی - ایم - اے

خواب وخیال ۶ر زہر عشق عہ ر شو پنہار عہ ر فلسفہ مذہب عہ ر تذکرہ خندۂ گل ۶ر انتخاب کلامی اردو ۸ر عرب و اس کا مستقبل عہ ر	**ایک ازراں سودا** ان سب کتابوں کی مجموعی قیمت علاوہ محصول ۱۵ آنے ہے لیکن یہ سب کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے میں آپ کو علاوہ محصول للعہ ر میں ملسکتی ہیں ہر آرڈر کے ساتھ چوتھائی قیمت آنا ضروری ہے —	شاعر کا انجام (۱۰ر) بحر تبسم عہ ر موج تبسم (عہ ر) فراست الید عہ ر مذاکرات نیاز (۱۲ر) فلاسفۂ قدیم عہ ر جذبات بھاشا (۱۲ر) لالہ رخ عہ ر فراست التحریر مکمل ..... عہ ر نقاب اٹھ جانے کے بعد ۵ر منیجر نگار لکھنؤ

دینِ مسیحی اور صنفِ نازک کی تحقیر

مسیحی دنیا کا دعویٰ ہے کہ نصرانیت نے عورت کا مرتبہ بہت بلند کر دیا اور نصرانیت عورتوں کی بہترین دوست و مددگار رہی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر فیربیرن لکھتے ہیں کہ نصرانیت نے عورت کے گرد "ایک حلقۂ تقدس" قائم کر دیا اور ہم کو عورت کا احترام کرنا سکھایا"۔ اسی طرح بعض عیسائی مصنفین لکھتے ہیں کہ "مشرک اور بت پرست لوگ عورت کو صرف خواہشات نفسانی کی تسکین کا آلہ سمجھتے تھے۔ مگر مسیحیت نے آکر عورت کی ذلیل حالت بدل دی"۔

لیکن کیا مسیحی دنیا کا یہ دعویٰ صحیح ہے۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے آپ نصرانی تمدن کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا۔ کہ نصرانیت نے عورت کی تذلیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور مسیحی دنیا میں عورت قانونی لحاظ سے ہمیشہ لاشئے محض سمجھی گئی۔ یعنی جانوروں تک کو کچھ نہ کچھ حقوق حاصل تھے اور نہیں تھے تو عورت کو —— چنانچہ امریکہ کی ایک خاتون الزبتھ کیڈی اسٹانٹن نے شہر بوسٹن کے طبقۂ نسواں کی حالت جو ۱۸۵۰ء میں تھی اس طرح ظاہر کی ہے:—

"عورت کوئی ملکیت نہیں رکھ سکتی تھی، نہ اکتساباً نہ وراثتاً۔ اگر وہ ناکتخدا تھی تو اس کی تمام جائداد اور ملکیت کسی ٹرسٹی کے سپرد ہو جاتی تھی۔ اگر عورت کا ارادہ شادی کرنے کا ہوتا تھا اور وہ اپنی ملکیت ٹرسٹی کے ہاتھوں سے نکالنا چاہتی تھی تو ازروئے قانون مجبور تھی کہ وہ تمام حقوق ملکیت اپنے شوہر کے حق میں منتقل کر دے۔ کوئی عورت خواہ وہ ناکتخدا ہو یا شادی شدہ، کوئی "شخص" نہیں تھی۔ خاندان بشری میں کوئی رکنیت نہیں رکھتی تھی۔ اور تمدن کے حساب میں صفر کی حیثیت رکھتی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔

شادی شدہ عورت کا مرتبہ گھر کی خادمہ سے شاید ہی کسی قدر بہتر ہوتا تھا۔ انگریزی قانون عامہ کی رو سے (جو بوسٹن میں رائج تھا) عورت کا شوہر اس کا آقا اور مالک ہوتا تھا۔ اپنی بیوی اور اس کے چھوٹے بچوں کا نگراں ہوتا تھا۔ وہ اس کو "نر انگشت" کے برابر موٹی چھڑی سے زد و کوب کر سکتا تھا مگر عورت اس کی کوئی شکایت نہیں کر سکتی تھی۔۔۔۔۔۔ قانون کی نظر میں میاں بیوی شخص واحد سمجھے جاتے تھے۔ مگر وہ شخص واحد شوہر ہوتا تھا۔ وہ بذریعہ وصیت اپنی بیوی کو اپنی ملکیت سے قطعی محروم کر سکتا تھا بلکہ اس ملکیت سے بھی محروم کر سکتا تھا جو قبل از شادی بیوی کی تھی۔ بیوی کوئی معاہدہ یا وصیت نہیں کر سکتی تھی اُسے کوئی ذاتی حقوق حاصل

نہ تھے بلکہ وہ اپنی جان کو بھی اپنی نہ کہہ سکتی تھی۔ اس کا شوہر اس کے بچوں کو چھین لے سکتا تھا۔ وہ اس کے کپڑے تک اتار لے سکتا تھا۔ اور وہ اس کے نان ونفقہ سے بھی غفلت کر سکتا تھا۔ اور اگر عورت محنت کر کے کچھ کمائی تھی تو شوہر اس کی تنخواہ خود پا لینے کا دعویٰ کر سکتا تھا۔

کیا طبقۂ نسواں کی تحقیر وتذلیل کی اس سے زیادہ کچھ اور ہو سکتی ہے؟ پھر غالباً دنیا یہ معلوم کر کے تعجب کرے گی کہ یہ تمام تحقیر وتذلیل نصرانیت ہی کی بدولت ہوئی۔ ورنہ نصرانیت سے بیشتر عورت آزاد تھی اور اس کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ اس حقیقت کا پورا علم حاصل کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ قبل ظہور نصرانیت جو حالت عورت کی تھی اس کا مطالعہ کیا جائے۔

عورت مسیح سے پہلے عیسائی پادری بابل وینوا کی عورتوں کی اخلاقی حالت ہمیشہ گری ہوئی ظاہر کرتے ہیں مگر قانون حمورابی کے دیکھنے سے جو مسیح سے ۲۱۰۰ سال قبل رائج تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیان بالکل غلط ہے، بلکہ برخلاف اس کے عورت کو نہایت عزت واحترام کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ ناظرین نگار، قانون مذکور کی دفعات ذیل کو ملاحظہ فرمائیں :-

دفعہ ۱۲۷ - اگر کوئی مرد کسی کاہنہ یا دوسرے مرد کی بیوی کی طرف ناجائز طور پر انگلی اٹھائیگا تو اس شخص کو قاضی کے سامنے پیش کیا جائیگا اور اس کی پیشانی پر مہر لگادی جائیگی۔

دفعہ ۱۳۴ - اگر کوئی شخص قید کر لیا جائے اور اس کی بیوی مجبور ہو کر دوسرے گھر میں بیٹھ جائے تو اس عورت کا یہ فعل ہرگز قابل الزام نہیں ہے۔

دفعہ ۱۳۷ - اگر کوئی مرد اپنی داشتہ عورت یا اپنی بیوی کو طلاق دیدے اس حال میں کہ اس کے اولاد ہے تو اس شخص پر لازم ہوگا کہ وہ اس عورت کو اس کا جہیز واپس کرے اور اس کو کشت زاروں کی پیداوار اور باغوں کے پھلوں اور جائداد کی آمدنی کا اس قدر حصہ دے کہ وہ عورت اپنے بچوں کی پرورش کر سکے۔

دفعہ ۱۳۸ - اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو جس کے اولاد پیدا نہیں ہوئی طلاق دے تو وہ اس کو اس عورت کا تمام مہر ادا کریگا اور اس کا تمام جہیز واپس کریگا جو وہ اپنے باپ کے یہاں سے لائی تھی۔

دفعہ ۱۳۹ - اگر عورت کا کوئی مہر مقرر نہیں ہوا تھا تو وہ اس عورت کو طلاق کے بعد ایک مینا (بابلی وزن یا پیمانہ) چاندی دیگا۔

دفعہ ۱۴۲ - اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے نفرت کرے تو اس نفرت (ناپسندیدگی

کے اسباب کی تحقیقات کی جائیگی - اگر وہ عورت محتاط و بیقصور ہے اور شوہر اس کی طرف سے غفلت کرتا ہے تو اس عورت پر کوئی الزام عائد نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنا جہیز لے لیگی اور میکے چلی جائے گی -

دفعہ ۱۷۱ - بیوی کو اس کا جہیز اور وہ تمام ملکیت ملے گی جو اس کے شوہر نے بذریعہ تحریر ہبہ کر دی ہے - اور وہ اپنے شوہر کے گھر جاکر رہیگی اور تمام ملکیت و مال سے متمتع ہوگی لیکن وہ اس مال کی ملکیت کو فروخت نہ کرسکے گی - اور اس کی وفات کے بعد اولاد کی ہوجائیگی

دیکھا آپ نے کہ یہ قانون ہر چند ۲۲۵۰ ق م کا ہے مگر اس قانون سے جو انگلستان و امریکہ میں چار ہزار برس بعد جاری ہوا کس قدر بلند ہے -

بابل میں اگر کسی مرد و عورت پر زنا کا جرم ثابت ہوجاتا تھا تو دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر فرات میں پھینکدیا جاتا تھا - اگر کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا مرتکب ہوتا تھا تو اس کو زندہ جلایا جاتا تھا - اسی طرح اگر کوئی عورت ناجائز بچہ جنتی تھی تو اس کو معہ بچہ کے زندہ جلا دیا جاتا تھا - اگر کوئی خسر اپنے لڑکے کی بیوی سے اختلاط کرتا تھا تو اُسے پانی میں ڈبو دیا جاتا تھا - اگر کوئی کاہنہ کسی شرابخانہ میں میخواری کے لئے جاتی تھی تو اسے زندہ جلا دیا جاتا تھا - اور کوئی عورت مندر میں فحش کی مرتکب نہیں ہوسکتی تھی -

بابل کے اولین خاندان شاہی کے عہد میں طبقہ نسواں کو جو آزادی حاصل تھی، اس کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کا ایک خاص طبقہ ایسا تھا جو خدمت دین کا پیشہ اختیار کر لیتی تھیں - مگر اُن کو اختیار حاصل تھا کہ جب ان کا دل چاہے وہ اپنی شادی کرلیں البتہ مندر میں داخل ہوتے وقت جو حلف اٹھالیا جاتا تھا اس کی رو سے انھیں ہمیشہ باکرہ رہنا پڑتا تھا اور وہ اولاد پیدا نہیں کرسکتی تھیں مگر وہ اپنی ذاتی ملکیت رکھ سکتی تھیں اور اُن کو جو رفعت و مرتبت سوسائٹی میں حاصل تھی اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس طبقہ میں شریف زادیاں حتیٰ کہ شہزادیاں تک داخل ہوجاتی تھیں - الغرض قدیم بابل میں عورت بالکل آزاد تھی - اس کے حقوق قانون کے ذریعہ سے محفوظ تھے - مرد کی طرح وہ بھی ملکیت کی قانوناً مالک ہوتی تھی اور وہ خود مختار تھی - اور اگر اس کا شوہر نالائق ہو تو وہ اُسے طلاق دے سکتی تھی -

طبقۂ نسواں کا یہی مرتبہ قدیم مصر میں بھی تھا - وہاں بھی عورت آزاد و مختار تھی - مشہور ماہر مصریات ڈاکٹر فلنڈرس پیٹری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "گھر میں شوہر کی حالت بالکل ایسی تھی جیسے کسی مہمان کی" ایک دوسرا ماہر مصریات ماسپیرو رقمطراز ہے کہ "شوہر ایک منظور نظر مہمان کی حیثیت رکھتا تھا" قدیم مصری مقابر کے اندر بہت سے کتبوں میں لکھا ہے کہ بیوی اپنے شوہر کی محبوبہ اور گھر کی مالکہ ہوتی تھی - اور اس زمانہ میں کوئی

چھڑی نر انگشت کے برابر موٹی" بیوی کو زدو کوب کرنے کے لئے مکان کے کونہ میں رکھی ہوئی نہ ہوتی تھی۔ مصر قدیم میں ایک کتاب چار ہزار برس سے بھی زیادہ قبل لکھی گئی تھی جس کا نام تھا "فتاح حاطب کے نکات حکیمہ" ایک نکتہ عورت کے متعلق کتاب مذکور میں یہ ہے کہ "اگر زنجیر اس کو پسند ہے تو دوگنی محبت کریگی" یہ زنجیر سلسلۂ مناکحت ہے۔ ایک جگہ شوہر کو نصیحت کی گئی ہے کہ "جب تھیں فرصت ملے تو اس (عورت) کا دل خوش کرو"۔ اور اگر عورت میں کوئی عیب ہو تو "کچھ عرصہ تک اس پر مہربانی و شفقت رکھو۔ گھر سے نکال دو بلکہ اسے نان نفقہ دو" الغرض قدیم مصر کی عورت بھی مرد سے درجۂ مساوات رکھتی تھی۔ وہ نہ صرف اپنی طرف سے عدالت میں مقدمہ دائر کرسکتی تھی بلکہ اپنی طرف سے وکالت بھی کرسکتی تھی۔ وہ طبابت کا پیشہ اختیار کرسکتی تھی۔ وہ بحیثیت کاہنہ عزت کی زندگی بسر کرسکتی تھی۔

قصر شاہی میں بحیثیت ملکہ اس کا درجہ فرعون کے برابر ہوتا تھا۔ اور مصر کی بہت سی ملکہ ایسی گذری ہیں جنھوں نے تاریخ میں بہت بڑا نام چھوڑا ہے۔ ہامان حاطب چہارم کی ماں ملکہ طوؔی اتنی صمیم العزم ملکہ تھی کہ اس نے ملک مصر میں مذہبی انقلاب پیدا کرکے اصنام پرستی کے بجائے توحید پرستی جاری کردی تھی۔

اسی طرح اہل کریٹ، خطیوں اور چینیوں کے قدیم تمدن کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ عورت کا مرتبہ اس وقت کتنا بلند تھا خصوصاً کریٹ میں جو عزت عورت کی کی جاتی تھی، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہاں کسی دیوتا کی پوجا نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کی پرستش گاہیں دیویوں ہی کے بتوں سے معمور تھیں۔ پھر ظاہر ہے کہ جو قوم عورت کی پرستار ہوگی اس کے نزدیک عورت کا درجہ کیا ہوگا۔

یہاں یہ عرض کردینا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ جب مسیحی علماء کے سامنے مندرجۂ بالا واقعات پیش کئے جاتے ہیں تو وہ عموماً یہ کہتے ہیں کہ مصری، بابلی و آشوری تمدن کی یہ ترقی صرف ان یہودیوں کی وجہ سے ہوئی جو بخت نصر کے زمانہ میں قید ہوکر وہاں پہونچ گئے تھے اور اُنھوں نے عہد نامۂ عتیق کی تعلیمات کو ان میں رائج کیا۔ لیکن اس کا جواب بہت آسان ہے کیونکہ توراۃ کی کتابیں زیادہ سے زیادہ ۵۸۶ یا ۹۰۱۴ سال قبل مسیح لکھی گئی تھیں اور ظاہر ہے کہ قانون حمورابی اس سے بہت پہلے کی چیز ہے۔ علاوہ اس کے خود توریت میں جو احکام عورت کے متعلق موجود ہیں اُنھیں سے کب عورت کی عزت ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ کتاب "موسیٰ احبار" کے باب ۳ میں حسب ذیل احکام ملاحظہ ہوں:۔

> پھر خدا نے موسیٰ سے ہمکلام ہوکر فرمایا کہ بنی اسرائیل سے کہہ دو کہ جو عورت حاملہ ہو اور لڑکا جنے تو وہ سات دن (ایام حیض کی طرح) ناپاک رہیگی۔۔ اور آٹھویں دن لڑکے کا ختنہ کیا جائے اور بعد اس کے وہ اپنے تئیں پاک کرنے میں تینتیس دن ٹھہری رہے۔ اور کسی مقدس چیز کو نہ چھوئے

اور جب تک اُس کے پاک ہونے کے دن نہ آئیں بیت المقدس میں داخل نہ ہو۔ اور اگر وہ لڑکی جنے تو دو ہفتہ ناپاک رہیگی اور چھیاسٹھ روز خون سے اپنے تئیں پاک کرنے میں ٹھہری رہے
آپ نے دیکھا کہ لڑکے کو لڑکی پر کس قدر جابرانہ ترجیح دیگئی۔ لڑکا جنے تو صرف سات دن ناپاک اور ۳۳ دن لہو سے اپنے تئیں پاک کرے۔ لیکن لڑکی جنے تو ایام ناپاکی اور خون سے صاف کرنے کے دنوں کی تعداد المضاعف ہو جائیگی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی الہامی حکم نہیں ہے بلکہ بنی اسرائیل کے قبائلی دستور و رواج میں بنی اسرائیل میں لڑکی کو حقیر و ذلیل مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ والدین لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر جانوروں کی طرح جس مرد کو چاہتے تھے سپرد کر دیتے تھے۔ لڑکی کو اس میں بولنے یا انتخاب شوہر کا کوئی حق حاصل نہ تھا، عورت کا خاوند اس کا مالک ہوتا تھا، نہ عورت کوئی حق ملکیت رکھتی تھی اور نہ اس کی شخصیت کسی شمار قطار میں تھی۔ اس کا شوہر جب چاہے اس کو طلاق دے سکتا تھا۔ مگر وہ اس کو نہیں چھوڑ سکتی تھی اب آپ خود فیصلہ کیجئے کہ بابلی عورتوں کا مرتبہ بلند تھا یا بنی اسرائیل کی عورتوں کا۔

عورت قدیم روما یونان میں

قدیم یونان میں اگرچہ عورت مرد کی محکوم تھی مگر وہ ذلیل و حقیر کسی حالت میں نہیں سمجھی جاتی تھی ابتداء میں، جیسا کہ تمام وحشی اور غیر متمدن اقوام میں ہوتا ہے، یہ رواج تھا کہ جو شخص کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا وہ اس لڑکی کے باپ کو نذرانہ دیا کرتا تھا مگر یہ رواج بہت جلد موقوف ہو گیا بلکہ اس کے بجائے یہ دستور ہوا کہ باپ اپنی لڑکی کو کچھ جہیز دینے لگا۔

قدیم ادبیات یونان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اول اول وہ لوگ عورت کو کوئی اعزازی درجہ نہ دیتے تھے اور اس کو پبلک زندگی میں شریک نہ کیا جاتا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد یونان میں تحریک آزادی نسواں پیدا ہوئی اور بڑی حد تک اُنھیں آزادی مل گئی۔

افلاطون لوگوں کو ہمیشہ سمجھایا کرتا تھا کہ عورتیں بھی وہی قابلیتیں رکھتی ہیں جو مردوں کو حاصل ہیں اس لئے انکو بھی وہی تعلیم دی جانا چاہئے جو مردوں کو دی جاتی ہے۔ ابیقیورس جو خاتم الحکما، یونان ہے مرد و عورت کو ہمیشہ برابر سمجھتا تھا۔ یسوع مسیح کے زمانہ کے قریب یونانیوں کا بہت بڑا مصنف پلوتارخ گذرا ہے، وہ بھی یہی کہتا تھا کہ دل و دماغ کے لحاظ سے عورت و مرد مساوی درجہ رکھتے ہیں۔

جمہوریہ رومہ کی ابتدائی صدیوں میں عورتیں یقیناً مرد سے فروتر سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن ظہور مسیح سے قبل ہی اس حالت میں بہت کچھ تغیر ہو گیا تھا اور رومی عورتوں نے سیاسیات میں قدم رکھنا شروع کر دیا تھا اور رومتہ الکبریٰ کے بازاروں میں حقوق طلب عورتوں کے مظاہرے اسی جوش و خروش سے ہوتے تھے جیسے مغربی دنیا

میں اس وقت نظر آتے ہیں۔ عورتیں قدامت پرست اراکین حکومت کا راستہ روک لیتی تھیں اور اپنے حقوق کا مطالبہ کیا کرتی تھیں۔ ان کی مالی حالت اتنی ترقی کر گئی تھی کہ ان کی ملکیت وجائداد محدود کرنے کے لئے ایک قانون بنانا پڑا کیونکہ مردوں کو یہ عام شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ ان کی بیویاں جو قرض ان کو دیتی ہیں، ان پر بہت سخت سود لیتی ہیں۔

تباہ شدہ شہر پومپیائی کے قدیم کھنڈر کھود کر بعض آثار قدیمہ برآمد کئے گئے ہیں جن میں بعض "الیکشن ایڈریس" بھی نکلے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب میں روم کی عورتیں بھی نہایت سرگرمی سے حصہ لیا کرتی تھیں۔ اور حکومت بلدیہ میں عورتیں بھی بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز ہوتی تھیں۔ خاص شہر روما میں ایک "عورتوں کا کلب" (Conventus matronarum) بھی تھا جس میں عورتیں سلطنت کے مسائل پر بحث وتمحیص کیا کرتی تھیں۔

رومیوں کے اندر نہ صرف فلاسفۂ یونان کی آزاد خیالی بلکہ فرقہ رواقیین (Stoics) کے اخلاقی اصول بھی سرایت کر گئے تھے۔ جس سے رومیوں میں پرانی انضباطی سختی کسی قدر ڈھیلی پڑ گئی تھی اور سلسلۂ تعلیمات نہایت وسیع اور آزاد بنیادوں پر قائم تھا۔ الغرض شیوع نصرانیت سے قبل ہی رومی عورتیں ان تمام قیود سے آزاد ہو گئی تھیں۔

طبقۂ نسواں پر نصرانیت کا اثر ظہور مسیحیت سے قبل امم قدیمہ میں عورت کا جو مرتبہ تھا اس کا حال تو آپ کو معلوم ہو گیا۔ اب دیکھئے کہ نصرانیت کا طرز عمل کیا رہا۔ اس کے متعلق انگلستان کا مشہور مقنن سر ہنری مین لکھتا ہے کہ "نصرانیت نے ابتدا ہی سے طبقۂ نسواں کی آزادی کا حلقہ تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور عورت کی غیر اہمیت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ چوتھی صدی عیسوی تک کوئی اصول نکاح متعین نہ ہوا بلکہ گیارہویں صدی عیسوی تک ادارۂ مناکحت کلیسا کے قبضہ سے باہر رہا۔

سینٹ آگسٹین نے خود ایک مرد کو اجازت دی تھی کہ اگر اس کی بیوی بانجھ ثابت ہو تو وہ اولاد پیدا کرنے کے لئے کوئی آشنا گھر میں ڈال لے۔ ایک اور عیسائی پادری نہایت فخر وناز سے فرمایا کرتے تھے کہ میں نے صرف گھر کی لونڈی سے اختلاط کرنے پر قناعت کی اور اس طرح اپنی عصمت وعفت کا خزانہ محفوظ رکھا۔ (ملاحظہ ہو کتاب "Eucharisticos" سطر ۱۶۶)۔

الغرض عیسائیوں کا یہ دعویٰ قطعی غلط ہے کہ نصرانیت نے عورتوں کا درجہ بلند کر دیا۔ شاہ روما تھیوڈوسیس کے زمانہ میں جو قوانین پادریوں کے اشارے سے مرتب کئے گئے تھے ان کے دیکھنے سے

معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت طبقۂ نسواں پر کس قدر ظلم و ستم کیا جاتا تھا۔ اُس نے چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد خالہ زاد بہن بھائیوں کی شادی ممنوع قرار دی۔ اُس نے شادی بیوگان پر سخت شرائط و قیود عاید کئے۔ اس نے حکم دیا کہ کوئی عورت طلاق لینے کے بعد پانچ برس تک دوسرا نکاح نہ کرے۔ اگر اس نے کسی سخت شکایت کی بنا پر شوہر سے علٰحدگی اختیار کر لی ہے تو وہ پانچ برس ٹھہرنے کے بعد نکاح کر سکے گی مگر اس کا حق وراثت زائل ہو جائیگا۔ اور اگر اُس نے کسی معمولی شکایت کی بنا پر طلاق لی ہے تو اس کا جہیز بھی ضبط ہو جائیگا۔ اور وہ دوسرا نکاح ہرگز نہیں کر سکے گی۔ اور وہ جلاوطن بھی کی جا سکتی ہے۔ مگر ان حالات کے ماتحت شوہر کو دوسرا نکاح کر لینے کی اجازت تھی۔

یہ ہے وہ مسیحی انصاف جو عورتوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ اور یہ ہے وہ "بلندی مرتبہ" جو طبقۂ نسواں نے اُس سب سے بڑے سخت اور متعصب عیسائی شہنشاہ کے زمانہ میں حاصل کی تھی۔ انیسویں صدی سے قبل نہ یسوع نے اور نہ یسوع کے کسی چیلے نے عورتوں کی مدد کی۔ بلکہ انیسویں صدی کا بھی تین چوتھائی زمانہ یوں ہی گذر گیا تھا۔

اناجیل کو اٹھا کر دیکھئے جہاں کہیں بھی یسوع نے اپنی ماں کی نسبت کوئی گفتگو کی ہے وہاں ہمیشہ سختی اور درشتی سے کام لیا ہے۔ ایک آیۃ بھی انجیل کی ایسی نہیں جس میں اُنھوں نے اپنی والدہ کا محبت کے ساتھ ذکر کیا ہو۔ یسوع کی نظروں میں عورت شیطان کا دام فریب تھی۔ اس لئے انھوں نے عورت کی طرف متوجہ ہونے کی کبھی زحمت گوارا نہ کی۔

یسوع کی طرح پولوس کی ذہنیت نے بھی عورت کے مرتبہ کو خاک میں ملا یا۔ اس کے نزدیک آدم کو بہکانے میں شیطان کا خاص آلۂ کار عورت ہی تھی۔ اسی روایت میں پولوس نے کتاب پیدائش کی اس روایت کو شامل کر دیا کہ عورت مرد کی پسلی سے اور مرد کے لئے بنائی گئی تھی۔ آدم کی حالت عدن کے باغ میں دیوتاؤں جیسی تھی مگر عورت نے اسے بہکا کر گناہ کرایا اور انسان کی پُر از آلام و مصائب دنیوی زندگی کا باعث ہوئی۔ پولوس کا حکم ہے کہ جو مرد سر ڈھکے دعا کرتا ہے وہ اپنے سر کو بے حرمت کرتا ہے۔ اور جو عورت بے سر ڈھکے ہوئے دعا کرتی ہے وہ اپنے سر کو بے حرمت کرتی ہے ...... مرد کو اپنا سر ڈھانپنا نہ چاہئے کیونکہ وہ خدا کی صورت اور اس کا جلال ہے۔ مگر عورت مرد کا جلال ہے۔ اس لئے کہ مرد عورت سے نہیں بلکہ عورت مرد سے ہے اور مرد عورت کے لئے نہیں بلکہ عورت مرد کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ پس عورت کو چاہئے کہ وہ اپنے سر پر محکوم ہونے کی علامت رکھے" (پولوس کا پہلا خط کرنتھیوں کے نام آیات ۱۱/۲)۔ دیکھا آپ نے پولوس نے عورت کا مرتبہ کس قدر بلند کر دیا ہے۔

الغرض عورت کی محکومیت اور عورت کا آدم سے پہلا گناہ کرانا یہی وہ دو خیالات ہیں جن کی وجہ سے مسیحی دنیا میں عورت کو ذلیل و حقیر سمجھا گیا۔

دوسری صدی میں جسٹن نے حکم لگایا کہ "جو مرد مطلقہ عورت سے نکاح کرتا ہے وہ زناکاری کا مجرم ہے"۔ اسی طرح اتھینا غورث نے دوسری شادی کی نسبت کہا کہ وہ مہذب قسم کی زناکاری ہے۔ اور سینٹ ہیل حکم دیتے ہیں کہ:- جب شوہر فحش کرکے آئے تو بیوی اس کو گھر میں واپس لے لیگی۔ مگر ایک گنہگار بیوی کو شوہر گھر سے نکال دیگا"۔

طرطولین صنف نازک کی نسبت لکھتا ہے کہ:- تو شیطان کا دروازہ ہے۔ تو نے ہی عدن میں درخت کا پھل آدم کو کھلایا۔ تو ہی وہ ہستی ہے جس نے سب سے پہلے خدائی قانون کو توڑا"۔

کلیمنٹ لکھتا ہے کہ:- "اگر عورت اپنے دل میں غور کرکے اپنی سرشت کو دیکھے تو وہ شرمندہ ہو جائے"۔ اور گریگوری نے تو عورت کی عصمت و عفت پر یہاں تک مہر لگا دی تھی کہ "تم کو ہزار میں ایک باعصمت و عفت مرد مل جائیگا مگر عورت ہزار میں ایک بھی نہ ملیگی"۔

سینٹ جیرم کا قول ہے کہ:- عورت تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اور نکاح ان لوگوں کے لئے اچھا ہے جو تنہا سونے سے ڈرتے ہیں"۔

الغرض نصرانیت کے نزدیک عورت کا یہ مرتبہ ہے کہ وہ "شیطان کا دروازہ ہے"۔ انسانی لعنت کا سبب اولین ہے۔ مسیح کی موت عورت کی وجہ سے واقع ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ الغرض پولوس سے لیکر آگسٹین تک تمام مسیحی لیڈروں نے عورت کے لئے حقارت آمیز الفاظ استعمال کئے

بائبل نے عورت کی تحقیر و تذلیل میں کس قدر حصہ لیا، اس کے متعلق ذیل کی چند آیات ملاحظہ ہوں:-

(۱) عورت کو تابعداری سیکھنا چاہیے۔ اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت مرد پر حکم چلائے بلکہ چپ چاپ رہے کیونکہ پہلے آدم بنایا گیا اس کے بعد حوا۔ اور آدم نے فریب نہیں کھایا بلکہ عورت فریب کھا کر گناہ میں پڑ گئی ۔۔۔۔"

(۲) اور جب تو لڑائی کے لئے اپنے دشمنوں پر خروج کرے اور خداوند تیرا ان کو تیرے ہاتھوں میں گرفتار کرائے اور تو انھیں اسیر کر لائے اور ان اسیروں میں خوبصورت عورت دیکھے اور تیرا جی چاہے تو اسے اپنی جورو بنائے تو تُو اسے گھر میں لا ۔۔۔۔۔۔ بعد اس کے تو اس سے خلوت کر ۔۔۔۔۔ بعد اُس کے اگر تو اُس سے خوش وقت نہ ہو تو جہاں وہ چاہے اُسے جانے دے ۔۔۔۔۔۔ نیز ملاحظہ ہو کتاب اعداد باب ۳۱ آیۃ ۱۸- "وہ لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لئے زندہ رکھو"۔

(۳) اے بیویو! اپنے شوہروں کی ایسی تابعدار ہو جیسے خداوند کی ـــــ کیونکہ شوہر بیوی کا سر ہے جیسا کہ مسیح کلیسا کا سر ہے ...... لیکن جیسے کلیسا مسیح کے تابع ہے ویسے ہی بیویاں بھی ہر بات میں اپنے شوہروں کے تابع ہوں ـــــ

(۴) - یسوع نے اپنی والدہ سے کہا :- اے عورت مجھے تجھ سے کیا واسطہ ؟ (ملاحظہ ہو انجیل یوحنا باب ۲ آیت ۴) ـــــ

(۵) بائبل میں "مادہ" کے لئے جو عبرانی لفظ استعمال ہوا ہے اس کے معنی اس قدر تکلیف دہ اور حیاسوز ہیں کہ ان کو سنکر شرم و غیرت بھی عرق عرق ہوئی جاتی ہے - یعنی "وہ چیز جس میں سوراخ کیا جائے"۔

بائبل میں اسی قسم کی صدہا آیات ہیں جن میں طبقۂ نسواں کی حد درجہ تذلیل و تحقیر کی گئی ہے - چلتے چلتے دو ایک آرا، عیسائی محققین کی بھی ملاحظہ فرما لیجئے - الیزبتھ کیڈی اسٹانٹن بائبل کی کتابوں کے بارہ میں لکھتی ہے کہ :- میری نظر سے کوئی کتاب ایسی نہیں گذری جس میں عورتوں کی تحقیر و تذلیل اس طرح سکھائی گئی ہو"۔

ہیلن گارڈ نر لکھتی ہیں :- جس ذلت و حقارت کی حالت میں عورتیں تھیں اس سے نہ مذہب نے نجات دلائی نہ یہوداہ نے بلکہ ان مردوں کی منصف مزاجی اور غیرت نے نجات دلائی جنھوں نے مذہب و یہوداہ کے احکام شریعت کو ٹھکرا دیا - پولوس نے عورت کو جس مقام پر باندھ رکھنے کی کوشش کی تھی وہاں سے عورت کو آزادی ان عظیم الشان اور بہادر مردوں نے دلائی ہے جنھوں نے پولوس کو بے حقیقت سمجھا اور جو پولوس کے خدا پر بھی سبقت لے گئے"۔

یوروپ کے قرون وسطیٰ میں عورتوں کی حالت

جرمنی کے مشہور اشتراکیت پسند مورخ ڈاکٹر بیبل نے لکھا ہے کہ ۵۸۵ء میں بمقام ماکون اسقفوں کی ایک کونسل منعقد ہوئی جس میں نہایت سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کیا گیا کہ عورت کے روح ہے یا نہیں ؟ - جب رومہ میں بت پرستی کا رواج تھا، اس وقت عورت ایک شخصیت رکھتی تھی - مگر جب نصرانیت کا زمانہ آیا تو اُس نے طبقۂ نسواں کو اس قدر ذلیل و حقیر کر دیا کہ عورت کو ایک جایداد، ایک محکوم مخلوق اور قطعی ادنیٰ درجہ کی مخلوق بنا دیا - الغرض پانچویں صدی عیسوی سے عورت کے مرتبہ کو جو تنزل شروع ہوا تو وہ گرتے گرتے قعر مذلت میں جا پڑی -

قرون وسطیٰ کے زمانہ میں انگلستان کے اندر بھی عام عورتوں کی حالت بہت خراب تھی - اکثر ممالک میں جہاں عہد بت پرستی کے جذبات ہنوز باقی تھے وہاں "عہد شجاعت" میں بھی طبقۂ امرا کی عورتوں کی حالت کسی قدر اچھی رہی - اگر کوئی شریف زادی حسین و جمیل ہوتی تھی تو اس زمانہ کے شہسوار بانکے اس پر لڑ بھڑ کر جانیں دیدیتے تھے - مگر طبقۂ ادنیٰ یعنی کاریگروں اور دکانداروں کی بیویوں اور بیٹیوں کی حالت

تہ بر تھی - ان کے لئے اس زمانہ کی دنیا بالکل جہنم تھی - شہسوار بانکوں کی ہوس ناکیوں اور نفس پرستیوں سے ی حفاظت نہ کوئی قانون کرتا تھا نہ کوئی مذہب -

قرون وسطیٰ میں ایک دستور اور بھی تھا جسے " حق شب اول " (Jus primae noctis) نے تھے - یعنی زمیندار کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنے کاشتکار کی لڑکی کو بعد از نکاح پہلی شب یا دو چار راتوں تک ے پاس رکھے - یہ رواج یوروپ کے بہت بڑے حصہ پر صدیوں تک جاری رہا بعض اوقات ایسا ہوتا تھا میندار اتفاق سے کوئی اسقف یا ابٹ ہوتا تھا اور اسے بھی حسب دستور " شب زفاف " کا حق حاصل تھا - اگر اسقف صاحب کے ملازم کسان کی لڑکی کو خوبصورت ظاہر کر دیتے تھے تو اسقف صاحب ایک شب کے لئے جیتے جی جنت میں پہونچ جاتے تھے - قرون وسطیٰ کے انگلستان میں بھی یہ رواج تھا - اور اس زمانہ کے زمیندار اور نواب اس وقت کا سخت انتظار کیا کرتے تھے جب کسی حسین وجمیل تا زادی کی شادی ہو اور انھیں " شب اول کا حق " نصیب ہو - انگلستان کے پادری آدم بیڈ نے لکھا ہے س کے زمانہ میں یہ رواج تھا کہ زمیندار اپنے علاقہ میں جس کسان کی لڑکی کو وضعدار دیکھتا تھا ، اسے ے حرم میں داخل کر لیا کرتا تھا اور جب وہ لڑکی حاملہ ہو جاتی تھی تو اُسے فروخت کر دیتا تھا " قرون لیٰ کے یوروپ میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ عصمت وعفت کس چیز کا نام ہے اور کسی کسان یا دہقانی کی کیا ل تھی کہ وہ اس امیر یا سپاہی کی شکایت زبان پر لا سکے جو اس کی لڑکی کی عصمت دری کرتا ہے - ڈی استانٹن نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ قرون وسطیٰ میں عورتوں سے جو برتاؤ کیا جاتا تھا اس میں سان تذلیل وتحقیر کی آخری حد تک پہونچ گیا تھا "

قدیم رومی تمدن کے زوال اور جدید مغربی تمدن کے عروج کے درمیان جو زمانہ گذرا ہے اس میں بزرگان ن مسیح یعنی اسقفوں کی یہ حالت تھی کہ وہ جلسے کر کر کے عورتوں کی تذلیل کیا کرتے تھے - چنانچہ سنہ ۵۸۶ء میں کونسل بمقام آگزیرہ منعقد ہوئی اور اس میں یہ فتویٰ دیا گیا کہ چونکہ عورتیں " ناپاک " ہیں اس لئے انھیں ردوں کی طرح عشاء ربانی کا جام اپنے ہاتھ میں ہر گز نہ لینا چاہیئے -

انھی بزرگان دین مسیحی کے فتاویٰ پر وہ قانون مرتب کیا گیا جسے عرف عام میں " قانون کلیسا -- " (Canon Law) کہتے ہیں چونکہ اس زمانہ میں تمام سیاہ وسفید کا مالک کلیسا تھا عنان قانون اسقفوں اور رئیسان دیر کے ہاتھوں میں تھی اس لئے انھوں نے عورتوں کے حق میں جو ہا کیا -

سنہ ۳۰ء تک یعنی جب تک بت پرستانہ تمدن کا اثر رہا عورت کی حالت بھی اچھی رہی اور یہ اچھی

حالت اس کی چار ہزار سال قبل مسیح سے چلی آتی تھی۔ مگر ۵۰۰ء کے بعد عورت قعر مذلت میں ڈال دی گئی اور اس کی اس قدر تحقیر و تذلیل ہوئی جس کی نظیر بت پرست زمانہ کی تاریخ میں بھی نہیں مل سکتی اور ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک یعنی جب تک دنیا پر نصرانیت کی گرفت قائم رہی عورت اسی ذلت کے غار میں پڑی رہی۔

جن لوگوں نے عورت کو سب سے زیادہ ذلیل سمجھا وہی کلیسا کی تاریخ میں مذہبی ہیرو اور اولیاء اللہ شمار کئے جاتے ہیں۔ مثلاً سینٹ گریگوری، سینٹ برنارڈ۔ سینٹ آگسٹین، سینٹ جیروم۔ حتیٰ کہ خود یسوع اور پولوس کی تعلیمات کا مطلب یہی ہے کہ عورت ایک حقیر و ذلیل چیز ہے۔ وہ بمقابلہ مرد کے ایک ادنیٰ مخلوق ہے۔ عورت ہی کی اخلاقی کمزوری کے باعث بنی نوع انسان شیطان کے قبضہ میں آئی اور آدم بہشت سے نکالا گیا۔ جس قدر عورت میں ناز و انداز اور غمزے ہوتے ہیں اتنے ہی کانٹے شیطان نے مچھلی پکڑنے کے لئے بچھا دیئے ہیں۔

سرمہ - کاجل - چورن - منجن

اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کرکے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے
دوسری تازہ سند ملاحظہ ہو۔ سرمہ ضعف بصارت وغیرہ کے لئے بہت مفید ہوا ایک شیشی اور بھجوا دیجئے

کاجل۔ آشوب سرخی ضعف بصارت کے لئے ازبس مفید ہے ایک ڈبیہ جو ایک شخص کے لئے سال بھر کو کافی ہے قیمت عہ
سرمہ۔ یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن میں تیار ہوتا ہے اس میں نہ ممیرہ ہے نہ کوئی معمولی سرمہ ہے جن کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا دھند موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ اور بارہا آزمایا ہوا ہے قیمت فی ڈبیہ عہ علاوہ محصول۔ **چورن**۔ یہ وہ اکسیری چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد قبض، نفخ، ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم، دستوں کا آنا سب یک لخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک چٹکی کھا لینے سے جاتا رہتا ہے قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول۔ **منجن**۔ اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول۔ **نوٹ**:۔ سب چیزیں منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف

پتہ:۔ م بیگم ذریعہ رسالہ نگار لکھنؤ

عصمت بی بی از بیچارگی

"غرض یہ کہ اِس بے لطف زندگی سے میری طبیعت اکتا گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ نے میری ہر فرمائش کی تعمیل کی خواہ اس میں کتنا ہی روپیہ صرف ہو، لیکن دنیا میں اس کے علاوہ اور بھی چیزیں ہیں جن کے لئے زندگی بیتاب رہتی ہے۔ اپنی آئندہ زندگی خوشگوار بنانے کے لئے ایک موقع ہاتھ آیا ہے۔ اور اس سے میں فائدہ اُٹھانا چاہتی ہوں اسلئے

ہمیشہ کے لئے خدا حافظ"

اس کے بعد دو تین جملے اور لکھ کر خورشید النساء نے دستخط کئے، اور لفافہ بند کر کے مکتوب الیہ کا نام لکھا ــــ "جب وہ یہاں آئیں گے تو اُن کی نظر ضرور اس پر پڑے گی" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

اس نے اپنے شوہر، حامد حسین خان کے کمرے کا رُخ کیا، اور دھڑکتے ہوئے دل سے سنگار کی میز کا خانہ کھینچا۔ جو چیزیں اس میں رکھی ہوئی تھیں ان کو ادھر ادھر ہٹا کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کو مناسب جگہ پر رکھ دیا مگر میز کے خانہ کو بند کرنا ہی چاہتی تھی کہ اس کے خیالات میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا، دم گھٹنے لگا۔ وہ گھبرا اٹھی، اور لفافہ کو وہاں سے اُٹھا کر کھڑکی کی طرف گئی۔ اس کو کھولا تو ہوا کے خنک جھونکوں کی وجہ سے پھر اس کے بے چین قلب میں کچھ سکون پیدا ہوا ــــ اور وہ اپنے ارادے پر زیادہ مضبوطی سے قائم ہو گئی۔

لوٹ کر لفافہ کو آئینہ کے سہارے ایک نمایاں جگہ پر رکھ دیا، اور جلدی جلدی اپنے کمرے کی طرف جا کر کریم بی کا نہایت بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔

اتنے میں کریم بی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اطلاع دی "سواری دروازے پر موجود ہے" خورشید نے ایک ٹرنک اور صندوقچہ اس کے حوالہ کیا، اور جھٹ پٹ موٹر میں سوار ہو گئی۔

"ابھی ساڑھے پانچ بجے ہیں" خورشید نے کریم بی سے مخاطب ہو کر کہا "اور ریل ساڑھے چھ بجے روانہ ہو گی" آدھا راستہ طے ہونے پایا تھا کہ مطلع ابر آلود ہو گیا اور بارش ہونے لگی۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ایک آدھ موٹر سرسے گزر جاتا تھا ورنہ سڑک صاف تھی۔ خورشید کا

موٹر نہایت تیزی سے گذر رہا تھا - ریل کے آنے میں ابھی دیر تھی اس لئے کریم بی نے خورشید کو ویٹنگ
میں پہونچا دیا ـــــ

چھ بج چکے، لیکن حکیم کا کوئی پتہ نہ تھا - خورشید اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی اور تاخیر کی
وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا خورشید کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا - او
طرح طرح کے خوفناک اور مایوس کن خیالات اس کے دل میں آ رہے تھے -

---

زنانہ ویٹنگ روم سے ملحق کمرے میں کچھ لوگ آپس میں گفتگو کر رہے ہیں - خورشید جس کرسی پر بیٹھی
ہے وہ اس بند دروازے سے ملی ہوئی ہے، جو دونوں کمروں کے درمیان واقع تھا ایک شخص نے کسی
قدر بلند آواز میں یہ خبر پڑھنی شروع کی "حیرت انگیز واقعہ، جواہرات کا سرقہ - عبدالحکیم نامی ایک خوش
پوش - نوجوان کو عین فرار کے وقت گرفتار کر لیا گیا - متعدد افراد نے نشان دہی کی "

حکیم کا نام سنتے ہی خورشید کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی - اس کا دل دھڑکنے لگا، اور آنکھوں
اندھیرا چھا گیا ـــــ اُس نے ضبط کر کے اپنے آپ کو سنبھالا، اور کریم بی سے ایک اخبار لانے
لئے کہا - سرورق پر حکیم کا فوٹو اور "جواہرات کا سرقہ" دیکھ کر اس کے ہوش اُڑ گئے اور سکتہ کا عالم طاری
ہو گیا ـــــ "واپس چلو ـــــ جلدی" خورشید نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، ا
اُٹھ کھڑی ہوئی - خادمہ نے دوڑ کر ایک موٹر کو اشارہ کیا اور خورشید اس میں سوار ہو گئی ـــــ
اب اس کے لئے صرف ایک اُمید رہ گئی تھی ـــــ یعنی حامد سے پہلے مکان پہونچ کر اس لفافہ کو اُٹھا
ـــــ بارش رک گئی تھی مطلع صاف تھا - ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آ رہی تھیں اور راستوں پر کا
چہل پہل تھی - خورشید بار بار شوفر کو تیز چلانے کے لئے کہہ رہی تھی - اس کی حالت اس خونیں مجرم کی سی
جس کے قصاص کا وقت قریب ہو، لیکن خفیف سی اُمید جان بخشی کی بھی ہو ـــــ اس کی یہ اُمید صرف ا
بات پر قائم تھی کہ حامد اس دن دیر سے گھر لوٹنے والا تھا -

موٹر مکان کے دروازے پر رکی، خادمہ نے دروازہ کھولا خورشید جھٹ سے مکان میں داخل ہو گئی
اور نہایت تیزی سے حامد کے کمرے کی طرف بڑھی ـــــ اپنے خط کو وہاں نہ پایا تو اس کے ہاتھ
کے طوطے اُڑ گئے، دل دھڑکنے لگا، اور وہ اُس آئینہ کے سامنے بت بنی کھڑی کی کھڑی رہ گئی -
یکا یک اس کی نظر حامد پر پڑی، جو پلنگ کے نیچے جھک کر کچھ ڈھونڈ رہا تھا -
حامد کی نظر خورشید پر پڑی تو اس نے پر استعجاب لہجہ میں کہا "کیوں آ گئیں!

وہ دم بخود ہوگئی۔ کوئی جواب نہ بن پڑتا تھا — اس کے ہونٹ خشک تھے، اور سانس نہایت تیزی کے ساتھ چل رہی تھی ——

"کب سے کف کے بٹن ڈھونڈھ رہا ہوں" حامد نے جھلا کر کہا۔

خورشید نے میز کے نیچے اپنا بند لفافہ دیکھا اور فوراً جھک کر اُس کو اُٹھالیا۔

میر حسن (جامعہ عثمانیہ)

نگار مفت بلکہ تین روپیہ تین آنہ اور زائد

یعنی

ایک سال تک نگار مفت پڑھیے اور تین روپیہ تین آنہ ہم سے اور لیجیے

اس کی ترکیب کیا ہے؟

نگار کے سرورق کو اُلٹ کر دیکھیے تو آپ کو ایک فہرست کتابوں کی نظر آئے گی جو نگارستان سے شروع ہو کر فراست التحریر پر ختم ہوتی ہے اس فہرست میں جتنی کتابیں درج ہیں ان کی قیمت علاوہ محصول ۲۳ روپیہ ہوتی ہے، لیکن اگر آپ ان تمام کتابوں کو اکٹھا طلب کریں گے تو علاوہ محصول صرف ۱۵ روپیہ میں دیجائیں گی یعنی آپ کو ۸ روپیہ کا فائدہ ہوگا۔ اگر آپ اسی ۸ روپیہ کی بچت میں سے نگار کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ادا کر دیں تو بھی تین روپیہ تین آنہ آپ کے پاس بچ رہیں گے۔

مگر یہ رعایت اسی وقت ممکن ہے

جب آپ نگار کا سالانہ چندہ بھیجدیں — وہ حضرات جن کا چندہ آئندہ دسمبر میں ختم ہو رہا ہے اُن کے لئے اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کا خاص موقعہ ہے — دسمبر سے پہلے بھی ہر خریدار خواہ جدید ہو یا قدیم اس رعایت سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ نگار کا چندہ سالانہ پیشگی بھیجدے۔

مینیجر نگار لکھنؤ

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟

دورِ حاضر کی روحانئین کی جماعت میں سب سے زیادہ دلچسپ بحث یہ ہے کہ "ماورائے قبر کیا ہوگا، کیسی سرزمین ہوگی، کیا موسم ہوگا، کیسے کھانے ملیں گے اور کس قسم کی صحبت میسر آئے گی۔ پڑھنے کے لئے عمدہ کتابیں۔ پہننے کے لئے عمدہ پوشاکیں اور محبت کرنے کے لئے جمیل صورتیں ملیں گی یا نہیں"

یہ مسئلہ واقعی بہت دلچسپ اور قابلِ غور ہے۔ ابھی تک اس مسئلہ پر کوئی قطعی رائے کسی ماہر فن کی دستیاب نہیں ہوسکی ہے۔ روحانئین کی ایک جماعت یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ روح قالب سے جدا ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک بے خبر رہتی ہے، نہ اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور نہ یہ کہ اس پر کیا گزر رہی ہے پھر جب اس کو احساس اس انقلاب کا ہوتا ہے تو وہ اپنے گرد و پیش ——— پر ایک غائر نظر ڈالتی ہے اور اپنی گزری ہوئی زندگی کی طرح وقت گزارنے لگتی ہے یعنی عالمِ ارواح میں بھی بالکل وہی مشاغل اختیار کرلیتی ہے جو دنیا میں اختیار کئے تھے۔

ایک سنجیدہ گروہ سرآلیور لاج کے اس عقیدہ کی جو اس نے ریمانڈ میں ظاہر کیا ہے تضحیک کرتا ہے کہ "ماورائے قبر دوکانیں ہیں، جہاں ارواح خرید و فروخت کرسکتی ہیں۔ اور جن کو عمدہ شرابیں، سگریٹ اور سوڈا وغیرہ مل سکتا ہے"، مسٹر ڈیل اون نے ویکلی ڈسپیچ میں اپنے اکتشافات ماورائے قبر کے متعلق

لہ ممکن ہے سرآلیور لاج کا یہ عقیدہ قابلِ مضحکہ قرار دیا جائے لیکن کم ازکم مسلمانوں کو اس کی تضحیک کا حق حاصل نہیں ہے، کیونکہ ان کی روایاتِ مذہبی میں بھی بکثرت اس نوع کی باتیں بہ سلسلۂ "لذائذ جنت" ظاہر کی جاتی ہیں۔ چنانچہ اہلِ اسلام کا یہ نہایت مشہور و معروف عقیدہ ہے کہ "جنتی جس چیز کی خواہش کریگا فوراً مہیا ہوجائے گی" پھر اس "ہر چیز" میں "شراباً طہوراً" تو خیر شامل ہی ہے، رہگیا سوڈا سو حوضِ کوثر کے چھلکتے ہوئے جام میں اگر یہ صفت بھی نہ پائی گئی کہ وہ حسبِ ضرورت و خواہش "آب نمک" بن جائے تو بات ہی کیا ہوئی، البتہ سگریٹ کا معاملہ ضرور غور طلب ہے کیونکہ جنت میں آگ کا پایا جانا مستبعد ہے، سو ممکن ہے اس کے لئے وہاں اک خاص قسم کی "آتشِ سرد" پیدا کر دی جائے اور شعاع "ماوراء البنفسجی" (Ultra Violet Rays) کی طرح کسی کو نظر نہ آئے۔

سرآلیور لاج اور مسلمانوں کے عقیدہ میں فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ مرنے کے بعد ہی (ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۴۳)

شائع کئے ہیں۔ اُن سے پتہ چلتا ہے کہ روحی میدانوں میں ہماری زندگی دنیاوی زندگی کا ایک صیقل شدہ آئینہ ہے، یہاں تک کہ اختلاط محبت، اور شادیاں بھی اس روحی دنیا میں پائی جاتی ہیں اور ہر شے اس دنیا سے زیادہ خوبصورت وہاں موجود ہے، لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ اس دنیا میں محبت نام ہے خواہشات نفسانی کا اور وہاں یہ بات نہیں ہے۔ روحانیئن کسی حد تک ہمارے برادران وطن کی طرح عقیدۂ تناسخ کے بھی قائل

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۲) بالتخصیص وتفریق ہر شخص کو ان لذائذ کا مستحق قرار دیتا ہے اور اہل اسلام صرف "مومنین تائبین" کیلئے مخصوص کرتے ہیں اور وہ بھی محض "فضائے فردوس" میں — ہو سکتا ہے کہ مرنے کے بعد فردوس تک پہونچنے کا جو زمانہ انتظار ہے اس میں مومنین کے لئے کوئی اور سامان تفریح ودلچسپی مہیا کر دیا جائے۔ کیونکہ خدا بڑا قدرت والا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے جو اس کے جی میں آئے اور انسان کی سمجھ میں کبھی نہ آئے —— تری شان جل جلالہٗ (اڈیٹر)

لہ خوب! یہ بات نہیں ہے تو پھر کیا ہے — کیا وہاں بھی اس امر کا اندیشہ، انسانی عصاب کو مضمحل کر دیگا کہ گناہ کیا نہیں اور "جنت کی حوریں" چھنی نہیں! اہل اسلام کے مذہبی لٹریچر میں جس جگہ حوران فردوس کا بیان ہے وہاں ان کے حسن وجمال "و شدتِ دوشیزگی" کا ذکر تو ضرور پایا جاتا ہے کہ لم یطمثہن قبلہم انس ولا جان (یعنی اس سے قبل ان کو کسی انس وجن نے ہاتھ ہی نہیں لگایا) لیکن کھلے الفاظ میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ ان حوروں کا مصرف کیا ہوگا — غالباً تہذیب وشائستگی مانع تھی کہ اس کا اظہار کیا جاتا اور صرف "ذہن سامع" یا "ولولۂ مومن" پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ اس خلا کو پُر کرے — اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ روحانیئن مغرب نے اس "محبت بے نفس" کا خیال کہاں سے پیدا کیا — ہو سکتا ہے کہ متصوفین کے "عشق حقیقی" سے استعارہ کیا گیا ہو، مگر اس کا تعلق تو غالباً "حسن مجرد" سے ہے، نہ کہ "حُسنِ انسانی" سے۔ بہرحال مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ عقیدہ بھی اک ناقص ونامکمل عقیدہ ہے اور وہ کبھی اس مفاہمت کے لئے طیار نہیں ہو سکتے کہ ساری عمر "نماز وروزہ وتسبیح وتوبہ استغفار" میں بسر کر دینے کے بعد اس کا اجر ملے بھی تو ایسی عورت کی صورت میں جسے وہ ہاتھ بھی نہ لگا سکیں!

غالب نے تو خیر جنت کے مفہوم میں یہ چیز بھی شامل کی ہے کہ "وہاں کی دیواروں میں روزن ہوں اور وہ اُن سے تاک جھانک کرے، یہ حوروں کو بُلائے اور وہ گریز کریں، یہ اُن سے پوچھے کہ کب ملوگی اور وہ جھوٹی قسم کھاکر کل پر ٹالدیں وغیرہ وغیرہ"۔ لیکن یہ تو ہیں غالب کی شاعرانہ بیہودگیاں جن پر اگر اُسے کافر قرار دیکر دوزخ میں ڈالدیا جائے تو عجب نہیں —— لیکن ہاں اب اتنی تہذیب بھی ٹھیک نہیں کہ "ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے"

الغرض مغربی روحانیئن کی یہ محبت بغیر ہیجان نفس، کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے —— افسوس ہے کہ یہ لوگ جو فطرت انسانی کے سمجھنے میں اپنے آپ کو بڑا ماہر جانتے ہیں، اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ "فلسفۂ لذت" کیا ہے۔ کاش یہ مولویوں کی تعلیمات کو سمجھیں اور اس کی حقیقت پر ایمان لائیں —— (اڈیٹر)

نظر آتے ہیں، لیکن ـــــ اس ترمیم کے ساتھ ـــــ کہ ایک مرتبہ جو انسان پیدا ہو چکا ہے وہ دوسرے جنم میں بھی انسان ہی پیدا ہوگا اور جانوروں کی صورت اختیار نہ کریگا۔

ایک مرتبہ چند احباب میز پر بیٹھے ہوئے معمول کے ذریعہ سے کچھ اخبار غیب معلوم کر رہے تھے کہ ایک صاحب بغیر اجازت کے کمرہ میں داخل ہو گئے اور دفعتاً وہ سلسلہ بند ہو گیا تھوڑی دیر کے بعد سُرخ روشنی دیواروں پر اور خصوصیت سے ان صاحب کے چہرہ پر پڑنے لگی - یہ دیکھ کر سب سہم گئے کیونکہ سُرخ رنگ کی روشنی نہایت شریر اور خوفناک ارواح خبیثہ کی علامت سمجھی جاتی ہے - سب کو سہما ہوا دیکھ کر وہ صاحب بھی سہم گئے تھوڑی دیر کے بعد دیوار پر لگی ہوئی گھنٹیاں زور سے بجنے لگیں - "وسیط" یا معمول سے حروف تہجی کے ذریعہ سے دریافت حال شروع کیا تو ش - م - ش - ا - حرف سمجھ میں آئے جن سے کوئی مفہوم نہ پیدا ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک نیلی روشنی رقص کرتی نظر آئی اور اُس نے سمٹ کر ایک انسانی چہرہ کی صورت اختیار کر لی لوگوں نے دریافت کیا کہ کس سے گفتگو مقصود ہے - وہ صاحب جو نووارد تھے کہنے لگے یہ تو میرے ایک مرحوم دوست ہیں جن کی موت پر اسرار طریقہ سے واقع ہوئی تھی آج ۲۵ برس کے بعد میں نے ان کو دیکھا ہے - ان کا نام شمشاد تھا - اب سب کو خیال آیا کہ ش - م - ش - ا جو حروف پیدا ہوے تھے وہ یقیناً شمشاد کے حروف تھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب وہ ماورائے قبر پُرسکون زندگی بسر نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک پیشہ ور عورت نے اُن کی روح کو پریشان کر رکھا ہے - دریافت سے معلوم ہوا کہ اِس دنیا کی زندگی بھی اسی دنیا کی زندگی کا باقی حصہ ہے اور جس طرح اس دنیا میں زندگی بسر کی ہے، اسی طرح دوسری دنیا میں بسر کریگا۔[1]

جب پوچھا گیا کہ وہ عورت کون ہے جس نے شمشاد کی روح کو پریشان کر رکھا ہے تو شمشاد نے وسیط کو اشارہ کیا اس نے پنسل اپنے ہاتھ میں لی اور غیر ارادی طور پر حسب ذیل نقشہ بن گیا۔

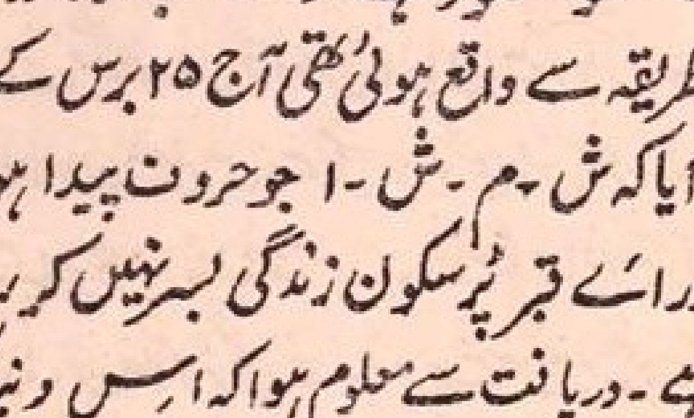

[1] کس قدر لغو و مہمل خیال ہے - یعنی جس نے اس دنیا میں عیش و مسرت سے زندگی بسر کی ہے وہاں وہ بھی مزہ میں رہیگا اور جس نے یہاں تکلیف اٹھائی ہے وہاں بھی مبتلائے آلام رہیگا - (اڈیٹر)

اس نقشہ کو کوئی سمجھ نہ سکا لیکن بعد کو تو وارد صاحب نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مقام ان کے مکان کے پشت پر واقع ہے جو اب مزبلہ کی حیثیت رکھتا ہے اُنھوں نے سمجھایا کہ شمال میں الف سے مطلب احمد علی کا مکان ہے، جنوب میں ب سے مطلب یہ ہے کہ بنک کی عمارت ہے، مشرق میں لالہ رام سین کی حویلی ہے اور مغرب میں بابو جے پال کی دوکانیں ہیں اسی جگہ ایک مسیحی اسپتال اور گرجا بھی تھا جہاں صلیب کا نشان بنا ہوا ہے اور ایک کنواں چند درخت اور ایک مزبلہ موجود ہے۔ جب دریافت کیا گیا تو روح نے کہا کہ اب بہت دیر ہوگئی ہے اس لئے وہ جانا چاہتی ہے چنانچہ دفعتاً وہ غائب ہوگئی۔"

لارڈ بردھم نے بھی اپنے سوانح حیات میں ایک واقعہ اسی قسم کا تحریر کیا ہے جو بہت دلچسپ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماورائے قبر بھی ارواح اپنے ان اعزہ سے جن سے دنیا میں انکا تعلق رہا ہے ملنے کی متمنی رہا کرتی ہیں اور جو وعدہ کرتی ہیں ان کو پورا کرنے کی بھی کوشش کرتی ہیں وہ لکھتا ہے:۔

"یہ واقعہ دسمبر ۱۷۹۹ء کا ہے، میں تعطیل کے زمانہ میں سویڈن گیا ہوا تھا موسم بہت سرد تھا میں نے نوکر کو گرم پانی کے لئے حکم دیا۔ حمام میں پانی رکھدیا گیا اور میں نہانے میں مشغول ہوگیا۔ جب میں طالب علم تھا اس زمانہ میں روحانیت کا بہت چرچا تھا۔ ایک طالب علم سے میری بہت دوستی تھی ہم دونوں نے وعدہ کیا کہ جو پہلے مرے وہ دوسرے کو اطلاع دے۔ میں تعلیم حاصل کرتا رہا اور میرا دوست فوج میں نوکر ہو کر ہندوستان چلا گیا۔ عرصہ سے اُس کی خبر نہ ملی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ مسکرا کر مجھے دیکھ رہا ہے میں ٹب میں تھا۔ جلدی سے میں نے کپڑے بدلے دیکھا کرسی پر وہ بیٹھا ہے اور مسکرا رہا ہے۔ میں سہم گیا اور گر پڑا جب ہوش آیا تو دیکھا کہ میں زمین پر پڑا ہوا ہوں اور کرسی خالی ہے۔ اس واقعہ کو میں نے کسی سے نہ کہا۔ میں اڈنبرا چلا گیا وہاں جا کر مجھکو اپنے دوست کے انتقال کی خبر ملی۔"

اسی طرح میرے ایک دوست نے یہ بیان کیا کہ مردہ وعدہ ضرور پورا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب کا بیان ہے کہ اُن کی نانی کو اپنی سہیلی سے بہت محبت تھی دونوں نے یہ وعدہ کیا کہ جو پہلے مر جائے وہ مرنے کے بعد اطلاع ضرور دے اور یہ بتلائے کہ ماورائے قبر کیا پیش آتا ہے چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد اُن کی سہیلی مر گئی۔ ان صاحب کی نانی کو بہت قلق ہوا اور وہ بھی علیل ہوگئیں۔ ایک دن ڈاکٹر انکو دیکھ کر باہر گئے تھے کہ وہ کہنے لگیں "آخاہ تم آگئیں! تم نے یقیناً اپنا وعدہ پورا کیا۔ کیوں وہاں پر کیسی گزرتی ہے تکلیف تو نہیں ہے۔" سب گھر والے اس واقعہ سے پریشان ہوگئے تھوڑی دیر کے بعد اس کا بخار اتر گیا اور بالکل سکون ہوگیا۔ دوسرے دن مریضہ نے بیان کیا کہ میں نے اپنی مری ہوئی سہیلی کو دیکھا ہے۔ اس واقعہ کے بعد مری ہوئی عورت کی تو اسی آئی تو اُس سے یہ واقعہ بیان کیا گیا اس نے کہا کہ بالکل

صحیح ہے۔ کیونکہ جس دن اُن کا انتقال ہوا ہے اس دن انھوں نے یہی لباس استعمال کیا تھا"

واقعہ یہ ہے کہ جس طرح اس زندگی میں ہم اپنے اعزہ سے ملاقات کے لئے بیتاب و مضطر رہتے ہیں اسی طرح ارواح بھی ہم سے ملنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ ایک عجیب بات ہے کہ ارواح بالعموم تاریکی میں نظر آیا کرتی ہیں اور زیادہ روشنی میں ارواح کا نظر آنا مشکل سمجھا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ جب یہ اشکال نظر آئیں ان کے فوٹو لئے گئے۔ ان میں گلیڈ اسٹون اور ڈکنس کی تصاویر بہت زیادہ ان کی اصلی تصاویر سے ملتی جلتی پائی گئی ہیں۔ اسی سلسلۂ تصویر کشی میں ایک شخص نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جس وقت کوئی روح آکر اپنے اعزہ کے حالات بیان کرتی ہے، اگر اس وقت کیمرا کی پلیٹ ہاتھ میں لے لی جائے اور وہ روح اس کو چھولے تو اس میں روح کی تصویر آجائے گی۔ چنانچہ ایک وسیط نے سنہ ۱۹۲۰ء میں یہ کمال کیا کہ جب حالت خاص میں وہ پلیٹ پر ہاتھ رکھتا تھا ایک شکل عجیب آجایا کرتی تھی اور حلقے کے اراکین اس کو دیکھکر یہ کہدیا کرتے تھے کہ یہ ہمارا فلاں آشنا سا ہے۔

لیکن اس طرح فریب بھی دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک وسیط نے یہ اعلان کیا کہ وہ ارواح سے تحائف بھی حاصل کر سکتی ہے۔ چنانچہ جب وسیط سے کہا گیا تو اُس نے اپنے ہاتھ ایک شخص کے ہاتھ میں دے دیئے۔ اور عامل نے اس پر عمل تنویم شروع کیا اب ارواح آنا شروع ہوئیں۔ اور جو کچھ مانگا گیا دینے لگیں۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ یہ سامان پہلے سے موجود تھا اور چونکہ کمرہ میں تاریکی تھی اس لئے کوئی اس شعبدہ کو سمجھ نہ سکا اور وسیط نے کافی روپیہ کمالیا۔

روحانئین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اگر شب و روز کوئی قوی شخص کمزور و نازک شخص پر قوت خیال صرف کرے تو وہ پریشان ہو کر ہر خواہش پورا کرنے کیلئے تیار ہوجائیگا اور آخر کار جب تک خیال ترک نہ کیا جائے اس کے قلب کو سکون میسر نہیں آئے گا۔

چنانچہ پنجاب کے ایک صاحب اکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اتفاقاً ایک لڑکی سے جو اسی کالج میں تعلیم حاصل کرتی تھی قلبی تعلق پیدا ہو گیا، لیکن اُس لڑکی کو اُن پنجابی صاحب سے یک گونہ نفرت تھی۔ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہندوستان واپس چلے آئے اور یہاں انھوں نے ایک یوگی سے یہ عمل سیکھا اور شب و روز اس لڑکی کا خیال کرنا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ــــ انگلستان میں اس لڑکی کی صحت خراب ہونا شروع ہوئی، بہت علاج کیا گیا مگر فائدہ نہ ہوا، آخر روحانئین کی ایک جماعت میں اس کی علالت بیان کی گئی تو ایک ڈاکٹر نے اس کے حالات دریافت کرنا شروع کئے اس گفتگو میں ان پنجابی صاحب کا بھی تذکرہ آیا۔ اس تذکرہ سے وہ لڑکی کچھ خائف معلوم ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے عمل تنویم سے یہ بتلایا کہ اُن پنجابی صاحب نے

قوت ارادی سے اُس لڑکی کو سزا دی ہے، لڑکی کے والدین نے اُن پنجابی صاحب کی خدمت میں لڑکی کی تصویر بھیجی اور درخواست کی کہ اس کو معاف کر دیا جائے۔ چنانچہ پنجابی صاحب نے بھی یہ سمجھکر کہ اب سزا کافی مل چکی ہے اس عمل کو چھوڑ دیا اور وہ لڑکی خود ہندوستان آگئی اور اُن سے شادی کرلی۔ یہ عورت وسیط کی حیثیت سے بہت عمدہ خدمات انجام دے سکتی تھی لیکن اُنھوں نے اس طرف توجہ نہ کی۔ اُس لڑکی کی علالت اور ہندوستان کی گرمی نے اس کی صحت کو بد سے بدتر بنا دیا اور اس کا انتقال ہوگیا۔

اس قسم کے واقعات بھی سنے گئے ہیں کہ عامل اپنے وسیط کے ذریعہ سے اخبار غیب بھی تبلا دیا کرتے ہیں۔ اور امراض کا علاج بھی کرتے ہیں۔ دنیا میں ایسی ہستیاں موجود ہیں جو اگر چاہیں تو اپنے خیالات سے دوسرے کو متاثر کر سکتی ہیں۔ اس قوت کا انحصار طبائع پر ہے۔ یہ ایک قسم کی مشق ہے، اگر ہم اپنے دماغ کو اس امر کا خوگر بنالیں کہ وہ دوسرے دل کی بات کا پتہ لگا سکے تو آسانی سے ممکن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ایک نابینا ———— راستہ کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ہے۔ اسی طرح انسانی خواہش بھی یہ ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد اس کی روح عیش وسکون حاصل کر سکے کیونکہ جہاں تک عقل کی رسائی ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ روح ایک غیر مادی چیز ہے اس لئے وہ نہ خراب ہو سکتی ہے اور نہ اس کو فنا ہے۔

سر آلیور لاج نے ڈیلی نیوز میں لکھا تھا کہ مادی اسباب نہ تو روح کو پیدا کرتے ہیں اور نہ اسے ہلاک کر سکتے ہیں، روح ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔ جسم خاکی صرف اس کی سیرت کو ایک خاص سانچہ میں ڈھال دیتا ہے، جسم سے رہائی حاصل کرنے کے بعد روح کو اپنے افعال میں آزادی تام ملجاتی ہے ایک مرتبہ لیونڈ شیپرڈ نے ڈیلی نیوز میں لکھا تھا کہ میں اکثر محسوس کرتا ہوں کہ مردے واقعی زندہ رہتے ہیں، ان کے اعمال اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ جسم خاکی چھوڑ کر بھی وہ اپنی بہبودی و فلاح میں منہمک رہتے ہیں حتیٰ کہ ابدی حیات کے مقررہ منازل طے کرنے کے بعد وہ قربِ خداوندی حاصل کر لیتے ہیں۔ جو مذہب کے نقطۂ خیال سے روح کا نصب العین ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر روح کا نصب العین تشنہ رہجاتا ہے تو وہ لوگوں کو دق کیا کرتی ہے، چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ بہرائچ اور بانسہ وغیرہ میں بعض عامل ارواح خبیثہ کو لوگوں کے جسموں سے جدا کر دیتے ہیں اور لوگوں کو صحتیں ہو جایا کرتی ہیں۔ بدروحیں نکالنا اناجیل سے بھی ثابت ہے کہ حضرت مسیح نے بھی بدروحیں نکالی تھیں ایک مرتبہ ایسا ہی واقعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک حسین بیوہ عورت سے ایک صاحب نے شادی کی تھی تو اکثر پہلے شوہر کی روح اُن صاحب کو دق کیا کرتی تھی اور بالآخر وہ صاحب کچھ سہم گئے اور اُنھوں نے اس حسین بیوی کو چھوڑ دیا اس وقت ان غریب کی جان بچی وہ حسینہ دق میں مبتلا ہوگئی اور آخر کار تیزاب پیکر

اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ جس کوٹھی میں وہ حسینہ مع اپنے سابق شوہر کے رہتی تھی وہاں اس کے سابق شوہر کی روح اکثر نظر آیا کرتی تھی لیکن جس دن سے وہ حسینہ مری ہے وہ روح کسی کو نظر نہیں آئی اور اب وہیں اسی کوٹھی میں ایک سرکاری دفتر موجود ہے۔

سر آلیور لاج نے اپنی کتاب حیات و ممات میں لکھا ہے کہ "موت کے بعد غالباً ہم وجود اثیری قبول کر لیتے ہیں اور تبادلۂ خیالات کے لئے قوت ممیزہ سے بھی افضل تر کوئی طاقت ہمیں حاصل ہو جاتی ہے اس تغیر سے ہم ایک ایسے عالم میں چلے جاتے ہیں جہاں محبت، سکون، خوشی اور امید مکمل طریقہ سے غیر فانی اور تسلی بخش طور پر نصیب ہوتی ہے۔

یہ خیال اب دنیا میں زیادہ راسخ ہوتا جاتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد اپنی قوتوں کو زائل نہیں کرتا بلکہ وہ دنیا کو اسی طریقہ سے فائدہ پہنچا سکتا ہے جس طرح ساری دنیا۔ ایک صاحب کا خیال ہے کہ اس دنیا میں بھی کلب ہیں، اخبار ہیں۔ فرقہ وارانہ مباحث میں کونسلیں ہیں، نمازیں ہیں، دعائیں ہیں، گانے بجانے ہیں، خوبصورت پلانے والیاں ہیں اور اطمینان و سکون سے زندگی بسر ہوتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو موت کے خوف سے ہم لوگ کیوں گھبرائیں؟

مشیر احمد علوی، بی، اے

(نگار)۔ سر آلیور لاج کو مابعد الطبیعیات و عالم ارواح کا بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے، لیکن میرے نزدیک شاید ہی کوئی شخص اُس سے زیادہ احمق بیسویں صدی کے دورِ علم و روشنی میں پیدا ہوا ہو — وہ اول اول "فلسفۂ تشکیک" کا بڑا زبردست حامی تھا۔ لیکن بعد کو جب ردّ عمل ہوا تو وہ عالم ارواح کے وجود کا بھی اسی شدت حماقت کے ساتھ حمایت کرنے لگا اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ "متشککین" کے خیال کا ردّ عمل اسی طرح کی توہم پرستی پر منتہی ہوتا ہے لیننن ڈائل کی دوسری مثال موجود ہے، دیکھ لیجئے۔

حقیقت یہ ہے کہ فطرت انسانی ہمیشہ اُس چیز کی جستجو میں لگی رہتی ہے، جو اس کے احاطۂ علم سے باہر ہے۔ پھر کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ علم انسانی بعض حقائق تک پہونچکر ان کے چہرہ کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے اور کبھی صرف اس کے قیاسات شدت انہماک سے ایک صورت اختیار کر لیتی ہیں اور وہ انھیں کو حقیقت باور کرنے لگتا ہے "مرنے کے بعد کیا ہوگا" — چونکہ یہ عالم انسانی کی سب سے زیادہ مخفی و غیر معلوم حقیقت ہے، اس لئے ہر زمانہ اور ہر ملک میں لوگوں نے

اس پر انتہائی غور و انہماک سے کام لیا یہاں تک کہ جب انسان کسی اور طرح مطمئن نہ ہوسکا تو مذاہب عالم نے اس مسئلہ کو اپنے حیطۂ اقتدار میں لیکر دو ٹوک فیصلہ کر دیا ــــــ مدعا صرف یہ تھا کہ انسان فضول خیال آرائیاں چھوڑ دے اور ان میں اپنا وقت نہ ضائع کرے ــــــ اور ہے بھی یہی بات کہ انسان کا موت سے پہلے موت کی گتھیاں سلجھانا انتہائی حماقت ہے۔ جب تک زندہ ہیں ہم کو اپنے کام میں لگا رہنا چاہیے، جب موت آئے گی چلدیں گے۔ اور اگر اس کے بعد کوئی اور زندگی ہے تو اس میں لگ جائیں گے، اس وقت اس کے خیال میں وقت ضائع کرنا نہایت لغو و مہمل بات ہے۔

اس میں شک نہیں کہ معاد کے خیال پر بہت کچھ انحصار انسان کی درستی اخلاق کا ہے، لیکن صرف اُسی جماعت کے لئے اور اُسی زمانہ تک جس کا تعلق "عہد تاریک" سے ہے اور جب تک انسان کے دماغ نے اس قدر ترقی نہیں کی ہے کہ وہ ایک اچھے کام کی اہمیت کا اندازہ محض اس کے "اچھے" ہونے کی حیثیت سے (بغیر خیال مُزد) کر سکے ـ پھر چونکہ مذاہب کی بنیاد ڈالنے والے ایک خاص قسم کا مصلحانہ دماغ لیکر آئے تھے اور وہ جانتے تھے کہ ان کی جماعت ترقی کے کس دور میں ہے اور وہ کس تعلیم سے متاثر ہوسکتی ہے، اس لئے اُنھوں نے "نفسیات تبلیغ و ہدایت" کے اصول سے کام لیکر اسی قسم کی باتیں لوگوں کو بتائیں جنھیں لوگ آسانی سے سمجھ سکیں اور جن کا اثر ہو ــــــ مذاہب عالم نے عالم کون کے معارف و حقائق سے کبھی بحث نہیں کی ہے، بلکہ صرف اصلاح نوع انسانی کو اصل مقصد قرار دیکر "عقاید" مخصوصہ کی طرح ڈالی ہے، اور ظاہر ہے کہ انکی اس فراست و دانشمندی سے کس کو انکار ہوسکتا ہے ـــ بہرحال جس حد تک صرف اصلاح کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ معاد کے اعتقاد نے بہت کچھ دنیا میں کیا ہے اور غالباً ابھی عرصۂ دراز تک کرتا رہیگا، لیکن اگر آپ "حقیقت" کا سوال کریں گے تو ماننا پڑے گا کہ "بعد الممات" کے متعلق اس وقت تک نہ کسی مذہب نے ایسی بات بتائی ہے جس پر ہر شخص کو اطمینان ہوسکے اور نہ علوم جدیدہ کی ترقی اس معمہ کو سلجھا سکی ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم مستقبل کو کسی طرح حال میں تبدیل نہیں کرسکتے اور انسان بندہ ہے صرف حال اور مشاہدۂ حال کا۔

مغربی لٹریچر میں کثرت سے حاضرات و طلب ارواح وغیرہ کے واقعات نظر آتے ہیں،

یہاں تک کہ روحوں کی تصاویر حاصل کر لینا، ان سے گفتگو کرنا بلکہ بسا اوقات اُن سے تعلق جنسی قائم ہو کر اولاد کا پیدا ہونا بھی حقیقت و واقعہ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے لیکن اس لٹریچر میں ۹/۱۰ حصہ تو محض پروپاگنڈا ہے اس جماعت کا جو ہندوستان کے گنڈا تعویذ لکھنے والوں کی طرح لوگوں کو احمق بناکر دولت کمانا چاہتی ہے اور باقی ۱/۱۰ نتیجہ ہے صرف "انسانی قوتِ انفعال" کا جو اپنے واہمہ میں مبتلا ہو کر خدا جانے کیا کیا دیکھنے لگتی ہے۔

امریکہ کے نہایت مشہور اخبار "سائنٹفک" نے ایک بار چند لوگ متعین کئے کہ وہ ہر جگہ جا کر تحقیق کریں کہ طلب ارواح کے دعوے میں کس حد تک حقیقت پائی جاتی ہے اور "وسیط" "معمول" کے بیانات قابل اعتبار ہیں یا نہیں ——— چنانچہ ایک زمانہ تک اس جماعت نے یورپ کے تمام ممالک کی سیر کی، تمام روحانیین سے ملے، معمولوں اور وسایط سے گفتگو کی، حاضرات میں شریک ہوئے، روحوں کے پیغام سُنے، ان کی تصویریں لئے جانیکا تماشہ دیکھا اور آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ یہ تمام دعوے بے بنیاد ہیں اور سو میں ایک بیان بھی ان روحانیین کا قابل اعتبار نہیں ہے۔ جس جس طرح یہ لوگ دہوکا دیتے ہیں، اور جن جن ترکیبوں سے یہ روحوں کی تصویریں لینا ظاہر کرتے ہیں، اُن کا مفصل حال اس کمیٹی نے قلمبند کیا اور اخبار مذکور میں شائع کرا دیا — الغرض وہ سر آلیور لاج ہوں یا کوئی اور بزرگ ان کی تمام تحقیقات وہم و قیاس سے آگے نہیں بڑھی اور اس مسئلہ پر اب بھی تاریکی کا وہی پردہ پڑا ہوا ہے جو اب سے ہزار سال قبل پڑا ہوا تھا ———

پھر چونکہ ہمارے پاس اس کے باور کرنے کی کوئی قوی وجہ موجود نہیں ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اسی طرح کی زندگی بسر کرنا پڑے گی جیسی اس دنیا میں بسر کی ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اس کا قائل ہے کہ مرنے کے بعد انسان پر "انعدام محض" کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بالکل نسیاً منسیا ہو جاتا ہے تو کسی کو اعتراض نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ بات تو بہت کچھ قرین عقل بھی ہے اور وہ عقل سے بڑی حد تک دور ———

شمیم

کا دوسرا ایڈیشن عمدہ کاغذ پر دو ضخیم جلدوں میں شایع ہوا ہے۔ رنگین تصاویر جو اسی ناول کے لئے صد ہا روپیہ صرف کر کے تیار کی گئی ہیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ قیمت ہر دو حصہ للعہ علاوہ محصول ڈاک (فرمائش کے ساتھ ۱۱ر کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں) "منیجر نگار لکھنؤ"

تاریخ کا ایک گم شدہ ورق

(وصل بعد از وصال)

نومبر ۱۸۴۸ء کی آٹھویں تاریخ ہے اور امیر عبد القادر جزائری معہ اپنی بیویوں، لڑکیوں، اور اعوان و انصار کے شہر امبواز کے ایک عالی شان قصر کے اندر فروکش ہوئے ہیں جسے حکومت فرانس نے اُن کے قیام کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔

امیر عبد القادر جزائری وہی وطن پرست و غیور امیر تھا جس نے اپنے ملک اور اپنے آبا و اجداد کی روایات شجاعت کی حمایت میں ایک زمانہ تک عساکر فرنساوی سے جنگ کی اور اگر دس بار خود شکست کھائی تو پانچ مرتبہ دشمن سے بھی اپنی تلوار کا لوہا منوا کر چھوڑا ـــــ لیکن فرانس کی زبردست حکومت و منظم فوج سے مقابلہ کرنا آسان نہ تھا، آخر کار اہل فرانس بلاد عربی میں ساحل سے لیکر ریگستانوں تک وسیع حصۂ زمین پر قابض ہوگئے اور ۲۸ راگست ۱۸۴۸ء کی شام کو امیر عبد القادر اپنی تلوار دشمن کے حوالہ کرنے پر مجبور ہو ہی گیا ـــــ ہر چند عساکر فرنساوی کے جنرل نے امیر موصوف سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر وہ اپنے آپ کو حوالہ کر دیں گے تو ان کو اجازت دیدیجائے گی کہ وہ شرقی دیار عرب میں جہاں چاہے چلے جائیں۔ لیکن حکومت فرانس اس عہد پر قائم نہ رہی اور انھیں فرانس بھیجدیا جہاں وہ قصر امبواز میں ایک قیدی کی حیثیت سے رکھے گئے۔ یہاں یہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۲ء تک رہے اور ۱۸۵۲ء میں جب انقلابی دور فرانس میں شروع ہوا تو امیر عبد القادر دمشق چلے آئے اور یہیں وفات پائی۔

ان لوگوں میں سے جنھوں نے امیر عبد القادر کا ساتھ دیا تھا اور جو اُن کے ساتھ امبواز میں نظر بند تھے ایک شخص عبد السمیع مغربی بھی تھا۔ اس نے جس طرح امیر کا ساتھ ان کے ایام کامیابی میں دیا تھا اسی طرح ادبار میں بھی دیا اور امیر کی محبت ترک کرنا کسی طرح گوارا نہ کیا۔ امیر بھی اس سے بہت محبت کرتے تھے اور اُن کو پوری طرح احساس تھا کہ اُس نے محض ان کی محبت میں اپنے وطن اور اہل و عیال سب کو خیر باد کہدیا تھا عبد السمیع امیر سے کہا کرتا کہ "اے میرے آقا" میں نے اپنے قلب کے دو ٹکڑے کر لئے ہیں ایک خدا کے لئے وقف ہے اور دوسرا آپ کے لئے" ـــــ لیکن اُسے خبر نہ تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آنے والا ہے جب اسے اپنے قلب کے تین حصے کرنا پڑیں گے اور ایک حصہ کسی اور ہستی کے لئے وقف کرنا پڑے گا ـــــ

یہ تھی ایک نوجوان فرانسیسی لڑکی کی تھی جس کا نام ارلس فونتان تھا - یہ لڑکی ایک خادمہ کی حیثیت سے امیر کے قصر میں کام کرتی تھی اور یہیں دونوں کے درمیان پیمانِ محبت استوار ہو گیا تھا اور اس نے بھی اپنے محبوب کے ساتھ اسیری کی زندگی اختیار کر لی تھی -

اتفاق سے ایک دن یہ لڑکی اپنے والدین و اعزہ سے ملنے گھر گئی تو انھوں نے اُس کو قید کر لیا اور پھر نہ جانے دیا، کیونکہ ان کو اس کے تعلق خاطر کا حال معلوم ہو گیا تھا اور وہ کسی طرح گوارا نہ کرتے تھے کہ وہ ایک غیر مذہب و غیر ملک کے انسان سے وابستگی پیدا کرے —— انھوں نے صاف صاف کہدیا تھا کہ "ہم کو تیری موت گوارا ہے لیکن غیر کفو میں شادی کرنا کسی طرح منظور نہیں" —— اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی عہد کیا کہ وہ امیر اور عبد السمیع دونوں سے اس کا انتقام لیں گے -

ہفتوں گزر گئے اور وہ لڑکی قصر تک واپس نہ آسکی - عبد السمیع کا تردد بڑھتا جا رہا تھا اور حیران تھا کہ اُس کی غیر حاضری کا سبب کیا قرار دے - آخر کار اُس نے دوسری لڑکیوں سے تحقیق حال کی اور جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی محبوبہ مقید ہے اور ہر وقت ملول و حزیں رہتی ہے تو اس کی تکلیفیں اور بڑھ گئیں

نومبر ۱۸۵۱ء کی پانچویں تاریخ صبح کو جب اہل قصر کی آنکھ کھلی تو سنا کہ بائیں باغ کے سمت سے فریاد و زاری کی آواز آ رہی ہے - سب لوگ دوڑ پڑے اور دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی رات کے لباس میں لوٹتی ہوئی چلی آ رہی ہے اس حال میں کہ اس کے سینہ اور پہلو سے خون جاری ہے - لوگ اس کو فوراً قصر کے اندر لے آئے اور علاج میں مصروف ہو گئے - یہ لڑکی زخموں کی تکلیف سے بیتاب تھی، درد سے تڑپ رہی تھی، لیکن عبد السمیع کا نام ہر وقت اس کی زبان پر تھا - لوگ حیران تھے کہ یہ کیا قصہ ہے - ابھی تک عبد السمیع کو بالکل علم نہ تھا کہ کون لڑکی کس حال میں قصر کے اندر آئی ہے - جب عبد السمیع نے یہ خبر سنی تو وہ بھی محض تماشائی کی حیثیت سے اس کو دیکھنے گیا، مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس کو معلوم ہوا کہ یہ تو اس کی محبوبہ تھی جس کے لئے وہ ہر وقت مضطرب رہا کرتا تھا اور جس کے دفعتاً غائب ہو جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی —— یہ بے اختیار اُس سے لپٹ گیا اور دیوانوں کی طرح اس کا مجروح سینہ اور غم آلود چہرہ چومنے لگا - لوگ حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے - جب جوش کم ہوا تو عبد السمیع نے بھی محسوس کیا کہ وہ مشرقی روایات تہذیب سے ہٹا جا رہا ہے اور اس لئے اس نے آہستگی سے لڑکی کا سر تکیہ پر رکھ دیا اور خاموش الگ کھڑا ہو گیا -

جب اس کے ساتھیوں نے پوچھا کہ "تمھاری شناسائی اس لڑکی سے کیونکر ہوئی اور اس نے تکلفی

و بیجا بی کے کیا معنی ہیں"۔ تو اُس نے کہا کہ "میں امیر کے روبرو تمام واقعات بیان کرونگا اور اگر مجھ سے کوئی گناہ ہوا ہے تو امیر ہی کے حضور میں سزا کو قبول کرونگا"

جب امیر عبد القادر کو اطلاع ہوئی تو حکم دیا کہ دونوں سامنے لائے جائیں۔ چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی اور ان دونوں نے اپنی داستان محبت کو شروع سے آخر تک دہرایا۔۔ لڑکی نے گھر میں قید کر لئے جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ " اے امیر آج میں نے گھر سے بھاگ نکلنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ خدا معلوم میرے بھائی کو کس طرح خبر ہوگئی۔ اور اُس نے مجھے راستہ میں پکڑ کر اصرار کیا کہ پھر گھر واپس جاؤں، لیکن جب میں کسی طرح راضی نہ ہوئی تو اُس نے اپنا خنجر نکال کر میرے پہلو اور سینہ میں پیوست کر دیا، میں گر پڑی اور وہ مجھے مردہ سمجھ کر بھاگ گیا"

لڑکی نے یہ کہا اور دفعتہً اس کی گردن شانہ کی طرف ڈھلنے لگی، حتیٰ کہ چند لمحوں کے اندر وہ زمین پر گر پڑی اس حال میں کہ اس کی رُوح پرواز کر چکی تھی اور اس کا جسم سرد ہو گیا تھا۔

امیر عبد القادر نے حکومت سے اس لڑکی کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت حاصل کر کے اُسے قصر کے جوار میں سبز سایہ دار درختوں کے نیچے مدفون کر دیا اور دیر تک اس واقعہ سے متاثر رہا۔

---

۱۱ دسمبر ۱۸۵۲ء کی صبح کو امیر عبد القادر معہ اپنے ساتھیوں کے امبواز سے کوچ کی طیاریاں کر رہے ہیں کیونکہ حکومت فرانس نے ان کو آزاد کر دیا اور اجازت دیدی ہے کہ جہاں جی چاہے چلے جائیں۔ امیر جب اہتمام سفر سے فارغ ہو کر اپنے ساتھیوں کا جائزہ لینے لگا تو معلوم ہوا کہ عبد السمیع ان میں موجود نہیں ہے۔

امیر نے جستجو کی تو دیکھا کہ عبد السمیع اپنے کمرے میں مردہ پڑا ہوا ہے اور ایک تحریر اس کے سینہ پر رکھی ہوئی ہے۔ جس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ

"اے امیر میں الیس فونتان کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا، اس لئے جائیے تو مجھے اس کے پاس دفن کر کے جائیے"

چنانچہ آج بھی فرانس کے شہر امبواز میں اگر کوئی سیاح جائے اور مسلمانوں کے قبرستان کی سیر کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ ایک گوشہ میں چند درختوں کے نیچے ایک قبر زرد پتھر کی پائی جاتی ہے جس کے سرہانے سنگ مرمر کی تختی نصب ہے۔۔ یہی ہے الیس فونتان اور عبد السمیع کی قبر جہاں وہ کبھی نہ جدا ہونے کے لئے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے مل گئے ہیں۔

انتخاب کلام افسوس

افسوس کا نام میر شیر علی تھا - یہ بیٹے تھے سید علی مظفر خاں کے - ان کا سلسلۂ نسب امام جعفر صادق تک پہونچتا ہے - اُن کے آبا و اجداد قصبۂ خواف (ایران) کے باشندے تھے اُن کے خاندان میں سب سے پہلے سید بدرالدین (سید عالم حاجی خانی کے بھائی) ہندوستان آئے اور نارنول میں قیام کیا۔

افسوس کی ولادت و تعلیم دہلی ہی میں ہوئی - جس وقت نواب عمدۃ الملک قتل ہوئے (۱۷۴۷ء) افسوس کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی اسلئے انکے والد اپنے بیٹے کو لیکر پٹنہ چلے گئے اور نواب جعفر علی خاں کی ملازمت میں آ گئے - پٹنہ میں انکا قیام ۱۷۶۰ء تک رہا جب نواب جعفر علی خاں (جو میر جعفر کے نام سے زیادہ مشہور ہیں) ۱۷۶۰ء میں معزول کئے گئے تو یہ لکھنؤ چلے آئے اور پھر حیدرآباد چلے گئے اور وہیں انکا انتقال ہوا ــــــــ

افسوس، اپنے والد کے لکھنؤ آنے سے دو سال قبل ہی لکھنؤ میں مقیم ہو گئے تھے اور نواب سالار جنگ کی سرپرستی حاصل کر چکے تھے - اور مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے مصاحب ہو گئے تھے - جہاندار شاہ، شاہ عالم کے بڑے بیٹے تھے اور دہلی سے لکھنؤ آ گئے تھے۔

چند سال قیام لکھنؤ کے بعد نواب آصف الدولہ کے نائب مرزا حسن رضا خاں نے افسوس کا تعارف رزیڈنٹ (کرنل اسکاٹ) سے کرا دیا - رزیڈنٹ کی سفارش لیکر یہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ گئے اور فورٹ ولیم کالج میں اردو کے میر منشی ہو گئے - ان کی تصانیف و تالیفات کی فہرست حسب ذیل ہے :-

۱- باغ اردو، ترجمۂ گلستاں، جو زمانۂ قیام لکھنؤ کی چیز ہے یہ ترجمہ ۱۷۹۹ء تک مکمل ہو گیا تھا۔

۲- ترتیب کلیات سودا - (کلکتہ کے قیام کے زمانہ میں)

۳- ان فارسی کتابوں کے ترجمہ کی صحت جو کالج کے اور منشیوں نے کی تھی۔

۴- آرائش محفل، یعنی خلاصۃ التواریخ کے ایک حصہ کا ترجمہ (خلاصۃ التواریخ ہندوستان کی تاریخ ہے جسے پٹیالہ کے منشی سوجان رائے نے ۱۶۹۵ء میں لکھا تھا) - آرائش محفل ۱۸۰۵ء میں مکمل ہوئی اور ۱۸۰۸ء میں کلکتہ کے اندر طبع ہوئی - بعد کو اس کا انگریزی ترجمہ ام - جے - کورٹ نے کیا اور ۱۸۷۱ء میں الہ آباد کے کسی مطبع میں اسکی طباعت ہوئی - اس کا دوسرا اڈیشن کلکتہ میں شایع ہوا (۱۸۸۲ء)

۵- اردو دیوان - جو لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں مرتب ہو گیا تھا - اور جو اب کمیاب ہے - افسوس کا ۱۸۰۹ء

ں انتقال ہوا۔

افسوس کے حالات اس سے قبل علاوہ نگار کے اور رسائل میں بھی شایع ہو چکے ہیں اور اُن کی تصانیف
بھی متعدد حضرات نے ریویو تحریر کئے ہیں، لیکن چونکہ اُن کا اردو دیوان کمیاب چیز ہے اس لئے نہ اس کا
تخاب کہیں شایع ہوا اور نہ اس پر رائے زنی کی گئی۔

اتفاق سے مجھے حیدرآباد کے کتب خانۂ آصفیہ میں ایک قلمی نسخہ دستیاب ہو گیا جس کا انتخاب
یش کیا جاتا ہے۔ کلام کے متعلق اظہارِ رائے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اس کو پڑھنے کے بعد بہ آسانی
علوم کر سکتا ہے کہ میر و درد کا رنگ کس پختگی کے ساتھ اُن کے کلام میں پایا جاتا ہے اور باوجود اس کے
افسوس نے لکھنؤ میں بیٹھکر اس دیوان کو مرتب کیا، مگر لکھنؤ کا کوئی اثر ان کے کلام پر نہیں پڑا۔

دیکھو بیتابی دل کی، اس در پر	ایک دن میں ہزار بار گیا
منزلِ عشق تک نہ پہونچا آہ	میں تو چلتے ہی چلتے ہار گیا
یاس سے اس کے سب گئے خورسند	ایک افسوس سوگوار گیا

اپنے دل کا ہو آشنا تو اگر	راز کھل جائے تجھ پہ ہر دل کا
آہ حسرت سے مر گئے ہم یار	نہ سنا تو نے دردِ دل کا
جی دیا اُس کے آگے سے نہ ٹلا	یار ٹک دیکھیو جگر دل کا

ہم نے مانا کہ شمع رو ہیں آپ	پر ہمیں کب تلک جلائیے گا
میں تو جی دینے پر بھی حاضر ہوں	کیا مجھے آپ آزمائیے گا

چرخ کی گردش سے اسکا آشیانہ چھٹ گیا	جی جہاں لگتا تھا وہ اپنا ٹھکانا چھٹ گیا
آہ زورِ ناتوانی یہاں تلک مجھ پر ہوا	گاہ گاہے کا بھی اس کوچہ کا جانا چھٹ گیا
سرسری بھی مجھ سے وہ ملتا نہیں آکر کبھو	آہ جس کے واسطے سارا زمانہ چھٹ گیا

ٹک دور سے بھی ایدھر نہ دیکھا　　ہم مر گئے تم نے پر نہ دیکھا
گو دید کیا جہان کو پر　　کب لطف اسی کہی گر نہ دیکھا
دم آنکھوں میں آگیا پہ تونے　　یکبار بھی رحم کر نہ دیکھا

کیونکر گندھے گی مجھ سے بھلا زلف پیچدار　　بالوں کے کھولتے ہی مرا جی بکھر گیا

نگہ ناز سے دیکھا جو ادھر اُسنے ٹک　　دل سے نکلی یہ صدا ہائے مرے تیر لگا
ایک عالم ترے دیدار سے یاں حیراں ہے　　اے مری جان تو کیوں دیکھنے تصویر لگا

آج اُس بزم میں ٹھہرا تو ہی جانا اپنا　　جی دھڑکتا ہے دلے دل ہے دِوانا اپنا
نہیں ملنے کے ترے کوچہ میں جو نقش قدم　　خاک میں ہم کو ہے منظور ملانا اپنا

کرنے نہ دیا ٹک تری آنکھوں کا نظارہ　　اس تیر نظر نے تو مجھے مفت ہی مارا
سب پھول جلے رشک سے بلبل کے اڑے ہوش　　جامہ جو ذرا باغ میں اس گل نے اتارا
جس شخص کے باعث سے ہوئے سیکڑوں دشمن　　صد حیف کہ وہ ہی نہوا دوست ہمارا

نے فقط ہیکل کا الجھا دلکو الجھائے گیا　　جان بھی بلکہ ترے بالے کا جھومکا لے گیا
شمع رو پھیکے نظر آتے ہیں اے خورشید رو　　نور ان دونوں کے منھ سے کس کا جلوا لے گیا

بے اختیار دوڑکے اس سے لپٹ گئے　　اس فرط شوق نے ہمیں کیا بے ادب کیا
اس مضطرب کا رات کو احوال دیکھئے　　جس نے کہ اپنے روز کو مر مر کے سب کیا

اے بخت تیرہ آگ لگے تجھکو آج پھر　　غیروں کے گھر وہ روشنی انجمن گیا

عرصۂ عمر بہت کم ہے وَلا گل کی طرح　　چمن دہر میں دن کاٹ تو ہنسکر اپنا

سر اپنا ڈھانپ لے ہے وقت شام اے حسن خدا کے واسطے یہ زلف مشکناب چھپا
سوتا ہے میرے ساتھ وہ مہ اے شب وصال دامن سے اپنے آج تو روئے سحر چھپا

پیارے کبھو کبھو تو لیا کر نگاہ لطف یا دل لیا نکر کسی خانہ خراب کا

ہے یاں تلک تو نزاکت گلوں کے گجروں سے کہ چھلنے لگتا ہے اس گلعذار کا پہنچا
قفس سے چھٹنے کی اُمید ہی نہیں افسوس حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچا

ہمیں تو دو کہتے رہتے تھے تم میاں افسوس یہ کہیے آپ کا دل دیکے امتیاز رہا

نازک دلی میں کیا کہوں اس سرو نازکی چٹکی جو ٹک بجائی کسی نے دہل پڑا

کیا گلہ اس کی بیوفائی کا کچھ بھروسہ ہے آشنائی کا
وصل میں چین کب رہا مجھکو دل کو دھڑکا رہا جدائی کا

کچھ یاد کر کے ہم بھی گلشن میں خوب روئے آباد گر کسی کا واں آشیان دیکھا

پھنسا زلفوں کا تیرے آج تک چھوٹا نہیں ظالم کبھو نکلا نہیں ڈوبا تری چاہ زنخدان کا
مجھے غش آگیا آنکھوں کے آگے برق سی چمکی سر دیوار رکھ کر ہاتھ وہ چنچل جو ٹک جھانکا

ساقیا کل زور کیفیت سے میں مستانہ تھا تھے لبوں میں اُسکے لب اور ہاتھ میں پیمانہ تھا
کیا بلا آنکھوں میں تیرے سحر ہے یک بھر نظر تو نے جس عاشق کو دیکھا بس وہیں دیوانہ تھا

دل صد چاک پہ کر ایک نظر بہر خدا گو کہ اس تیر کے لائق یہ نشانہ نہ رہا
سوز حرماں سے جلا دل تو بلا سے پیارے پر یہ غم ہے کہ ترے غم کا ٹھکانا نہ رہا

نزع میں زرد تھا رُخ افسوس   چنپئی رنگ نے اُسے مارا

نے خُلق تجھ میں ہے نہ مروت نہ ٹک وفا   حیرت میں ہوں کہ دل تری کس بات پر گیا

چھلا تری انگشت کا آجائے اگر ہاتھ   بھولے سے نہ لوں نام سلیماں کے نگیں کا

مجھکو کل بھا گئی شمیم صبا   اس میں کچھ میل تھا تری بو کا

ٹک ہلا ہونٹ اے مسیح نفس   تیرا بیمار جاں بلب ہے اب
سانس لیتا ہوں میں بدشواری   طاقت آہ مجھ میں کب ہے اب

مت بیٹھ وقت نزع تو یاں اے حسیں بہت   الفت نکر تو آہ دم واپسیں بہت
یہ کون جانے جھوٹ ہے یا سچ ولیک آج   اس کم سخن نے پیار کی باتیں تو کیں بہت
دشنام سیکڑوں سنے یا گالیاں ہزار   پر اُسکے منھ کی میں نے بلائیں تو لیں بہت

اے عندلیب آتش گل سے پناہ مانگ   گو ہے چمن کے بیچ ترا آشیاں بلند
افسوس دل جلے کی خدا خیر ہی کرے   اس کی گلی میں آج ہوا ہے دھواں بلند

نظر لگ جائے گی اس گل کو نرگس   نہ دیکھ اس طرح اپنی آنکھ کر بند

کیا جانے یہ آہ ہے کہ کیا ہے   کچھ آگ سی آئی ہے زبان پر

اغیار ادھر ہی تک رہے ہیں   دیکھیں تجھے کس طرح بلا کر

مطرب نہ بجا ساز نہ تکلیف کرا تنی   رو دینے کو بس ہے ہمیں اک تار کی آواز

وہ رشک ماہ تو اس شب ہی مجھ پاس ٹک اک تھم تھم کے اے چرخ کہن چل

اے آفتاب صبح کو تو اُسکے منھ نہ چڑھ ایسا نہ ہو کہ ہو کہیں وہ مست خواب گرم

پھر نہ آویں گے کبھی بزم میں تقصیر ہوئی غصہ کا ہی کے تئیں کرتے ہو لو جاتے ہیں
ہوش میں آتے ہیں ای یار اگر ہم گاہے تو ترے کوچہ میں ٹک آن کے رو جاتے ہیں

بزم میں اسکے نہ ہنستے ہیں نہ رو سکتے ہیں چپکے بیٹھے ہوئے ہر ایک کا منھ تکتے ہیں
آتشین اشک سے یہ دیدۂ تر چلتے ہیں دیکھ لو مردم آبی کے بھی پر جلتے ہیں

کیا فائدہ جو پوچھئے احوال دلِ افسوس سے منھ دیکھ رو دیتا ہے وہ پر بات کچھ کہتا نہیں

سر کہے ہے ذرہ ذرہ کرے ہے نہیں نہیں کس چو چلے سے آئے ہے میرے کنار میں

نالہ و فغاں گریہ و زاری ہم نے تجھ بن کیا نہ کیا مرنا اک باقی ہے پیارے سو وہ اپنے ہاتھ نہیں

بیتاب بہت ہوں آج یارو ٹک لیچلو اس کے پاس مجھکو

یہاں جلنے کو یارو ایک داغ بیکسی بس ہے چراغ و شمع کی حاجت نہیں گور غریباں کو

دیکھتے ہی اُسے حاضر ہوئے مرجانے کو وہ ہی غمخوار جو یاں آئے تھے سمجھانے کو
جھڑکیوں کا ترے انداز ہر اک کیا جانے جی سمجھتا ہے ترے ناز سے جھنجھلانے کو

ہوئی ہے اس قدر حالت مری ابتر ترے غم میں کہ رو دیوے ہے ہر اک دوست دشمن دیکھکر مجھکو

نکل کرتن سے جان منتظر آنکھوں میں پھرتی ہے
جواب بھی آئے تو دیکھ لیویں اک نظر تجھکو

پیچھے میرے قفس پاس نکر اے بلبل
جی نکل جائے گا میرا تری آواز کے ساتھ

شب مہتاب میں سینے سے لگ جا
گلے میں ڈال کر اے ماہرو ہاتھ

کرتا ہوں طلب بوسہ جو اس سے تو پھرا منھ
کہتا ہے وہ ہنس ہنس کے بہ تکرار اجی واہ

جو دم ہے واہ واہ ہے مند جائیں گی پھر آنکھیں
ٹک دید اور کریں اس گلشن جہاں کی

کب سیر کی چمن کی کس وقت لی اجازت
تیوری چڑھی ہی دیکھی نت ہم نے باغباں کی

دید گل کی کر کے ایکدم باغباں اُٹھ جاؤں گا
اور کچھ مطلب نہیں ہے اس گلستاں سے مجھے

دوستوں کے بیچ چل جاتی ہیں تلواریں دلا
ناز سے ٹک اس کے ابرو کا جو خم چڑھ جائے ہے

اے مست شراب حسن و خوبی
ٹک ہم کو بھی انکھڑیاں دکھا لے

کیونکر کوئی جی بچائے اس سے
جو آنکھ ملائے مار ڈالے

طرفہ صحبت ہے لگاوٹ نکروں گر اس سے
تو وہ رہ رہ کے ہر اک بات پہ جھنجھلاتا ہے

آہ اے بخت زبوں سعی تجسس کے بیچ
جان بھی جاتی رہی لیک نہ جاناں سے ملے

جتنے بیٹھے تھے اس گلی کے بیچ
اپنے زانو پہ سر جھکائے تھے

کھنچیے مت نگاہ قہر سے چلے
بس تمھیں دیکھنے ہی آئے تھے

کل کی نسبت تو حضرت افسوس
آج ٹک ہوش میں بھی آئے تھے

لیک پڑھتے تھے بس یہی اک بیت آنسو آنکھوں میں ڈبڈبائے تھے
اے ستمگار تجھ سے کیا ہم نے جان کھونے کو دل لگائے تھے

چڑھ کے کوٹھے پہ ذرا دیکھ تو دیوار تلے کوئی جی توڑے ہے ظالم تری دیوار تلے

تیرے سر صدقے ہوا افسوس گو بسمل ہوا تو نے پوچھا کہ عبث شمشیر کے ٹکڑے کئے

احوال دوست پوچھئے افسوس کس سے جا قاصد پھرا نہ ایک بھی اسکے دیار سے

اسکے ملنے کی ٹک نہیں اُمید کس طرح دل کو آج کل آئے

نہیں یاد چمن صیاد دیکھ گلستاں بھولے قفس میں جی لگا ایسا کہ اپنا آشیاں بھولے

دیدۂ گریاں نے ٹک فرصت نہ دی ناچار ہو رکھدیا میں کاغذ تحریر اپنے ہاتھ سے

روز محشر تلک جو صبح نہ ہو سو وہ یار و شب جدائی ہے

دکھلا گیا وہ نزع میں اپنے تئیں مجھے دکھ دے گیا یہ اور دم واپسیں مجھے
یہ ہو گیا ہے حال ترے غم سے اندنوں روتے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ہمنشیں مجھے
میں متھ وہاں ہر ایک کا چپکا تکا کیا جس تس نے آہ سیکڑوں باتیں کہیں مجھے

کیا تو نے لکھا تھا کہ مرے خط کے تئیں دیکھ آنسو لگے افسوس کی آنکھوں سے ٹپکنے

کیا عشق پھر ہوا ہے تجھے افسوس اندنوں چہرہ اتر گیا ہے ترا رنگ زرد ہے

دل کی دل میں رہ گئی حیرت کے باعث وصل میں　　کچھ نہ اس سے کر سکے گفتار منہ دیکھا کئے
تو نے جانا منہ پھرا بیٹھا ہے لیکن ہر گھڑی　　ہم کنکھیوں سے ترا اے یار منہ دیکھا کئے

یارو اب کیا کروں میں آہ کدھر کو جاؤں　　مجھ سے وہ شوخ سر راہ جدا ہوتا ہے

روتے روتے عمر گزری کلبۂ احزاں کے بیچ　　غیر اس دل کے کسی نے میری غمخواری نہ کی

سو طرح اس سے کہوں درد دل اپنا لیکن　　دیکھ کر اس کو اگر کچھ بھی مجھے ہوش رہے

قیامت لگاوٹ ہے آنکھوں کے بیچ　　جسے مڑ کے دیکھا لگائے چلے

جو معشوق اس سے جدا نت رہے　　نہ مر جائے عاشق تو پھر کیا کرے

جلتے جلتے ہی کٹ گئی سب عمر　　ہم نے جوں شمع زندگانی کی

جو غم میں تھے انیس وہ غمخوار کیا ہوئے　　تنہا پڑا ہوں ساتھ کے سب یار کیا ہوئے
فصل خزاں میں رو رو یہ کہتی ہیں بلبلیں　　کرتے تھے سیر جس میں وہ گلزار کیا ہوئے
نالہ میں اب قفس میں اکیلا کروں ہوں آہ　　کیا جانئے کہ اور گرفتار کیا ہوئے

زندگی کی مجھے اُمید نہیں　　اس قدر دل کو بیقراری ہے

اُس کے کوچہ میں دل کو کھو بیٹھے　　زیست سے نا اُمید ہو بیٹھے
کہوں اپنی خرابی کیا عزیز جس کا عاشق ہوں　　وہ ظالم ہائے میرے نام سے بھی ننگ رکھتا ہے

قتل افسوس کو کیا تو نے　　اے ستمگر یہ کیا کیا تو نے

سامعہ سے دل تک

انسان کی اکثر عزیز ترین چیزیں وہی ہوتی ہیں جو اکثر اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہیں

ایک انسان اپنی پسند کی چیز کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک بہت سی ناگوار باتوں کو برداشت نہ کرے

حُسن سب سے پہلی نعمت ہے جو فطرت ایک عورت کو عطا کرتی ہے اور یہی وہ اولین نعمت ہے جسے وہ سب سے پہلے چھین لیتی ہے۔

ایک شخص اگر دشمن سے انتقام لیتا ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بھی ویسا ہی ہو گیا۔

انسان کی مسرت اس سے وابستہ نہیں جو جیب میں ہے بلکہ اس سے جو قلب میں ہے

جب انسان کی صحت کھونے لگتی ہے تب اس کی حفاظت کی فکر ہوتی ہے۔

جب تک دولت رہتی ہے ایک انسان کو خائف رکھتی ہے اور جب وہ غائب ہو جاتی ہے تو رنجیدہ بنا کر جاتی ہے۔

آنکھ کی آسودگی، معدہ کی آسودگی سے زیادہ دشوار ہے۔

اگر تم مسرور نہیں ہو، تو اس کے معنے یہ ہیں کہ تم وہ چیز طلب کرتے ہو جو تمھاری نہیں ہے اور اُس کو بھول جاتے ہو جو تمھارے پاس ہے۔

ایک شخص کا مرنا اس حال میں کہ وہ اپنے دشمنوں کے لئے دولت چھوڑ جائے اس جینے سے بہتر ہے جس میں وہ اپنے دوستوں کا محتاج رہا ہو،

صحافت کی آزادی مطالعۂ انسانی کا حق ہے نہ کہ تحریر و انشاء کا

بھوڑی چیز قائم رہنے والی اس بہت سی چیز سے بہتر ہے جو جلد فنا ہو جانے والی ہے

اعتبارات

"کیا یہ آسمان وزمین، یہ وسیع کائنات، یہ بیشمار مخلوق، اور یہ نظام عالم آپ ہی آپ وجود میں آگیا؟ سورج کا روز ایک مقررہ وقت پر نکلنا، موسموں کا مخصوص حالات کے ساتھ رونما ہونا، چاند کا یکساں طور پر گھٹنا بڑھنا اور اسی طرح کے تمام تو امیس طبعی و مظاہر فطرت کیا اس امر کی دلیل نہیں کہ ان سب کا پیدا کرنے والا اور سنبھالنے والا کوئی اور ہے ـــــ کیا ممکن ہے کہ کوئی چیز بغیر خالق کے اپنے آپ پیدا ہو جائے، کیا عقل انسانی باور کر سکتی ہے کہ دھواں اُٹھے اور آگ کا وجود نہ مانا جائے"

ـــــ یہ تھا خلاصہ ان دلائل کا جو ایک عالم دین کسی ملحد کے سامنے بیان کر رہا تھا۔

میں ان دلائل کو سنکر ایک خاص قسم کے ایقان کی روشنی دل و دماغ میں محسوس کر رہا تھا اور خوش تھا کہ ملحد ان دلائل کی تردید کبھی نہیں کر سکتا ـــــ

اُس نے مسکراتے ہوئے سر اُٹھایا اور بولا ـــــ "اگر یہ تمام چیزیں، یہ جملہ کیفیات ازخود پیدا نہیں ہو سکتیں اُن کے خالق کا تصور اس لئے ضروری ہے کہ مصنوع کو دیکھ کر صانع کا یقین لازم ہے تو بتائیے کہ خدا کو کسنے بنایا اور وہ ازخود کیونکر پیدا ہو گیا" ـــــ عالم دین نے یہ سنکر کہا کہ "اے بیوقوف، تو بالکل نہیں سمجھتا۔ خدا تو ازلی و ابدی ہے، اس کو کسی نے نہیں بنایا، بلکہ اس نے سب کو بنایا ہے اس لئے تیرا یہ اعتراض بالکل غلط ہے"۔ ملحد نے کہا کہ "خوب جو آپ کا دعوے ہے وہی آپ کی دلیل ہے۔ اگر آپ کسی کو ازخود پیدا ہونے والا مان سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کائنات کو ایسا نہ مانیں اور اگر کائنات کے لئے یہ ممکن نہیں تو پھر خدا کے لئے اس کا امکان کیوں ہو؟"

میں یہ سنکر غصہ سے بیتاب ہو گیا اور عالم دین سے مخاطب ہو کر بولا "حضرت، یہ شیطان ہے اس سے گفتگو نہ کیجئے۔ لاحول پڑھیئے اور کہدیجئے کہ ہم نے خدا کو بلا کسی دلیل کے پہچانا ہے"۔ ملحد یہ سنتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور یہ کہتا ہوا چلدیا کہ:-

"اگر بے دلیل کسی بات کا ماننا کوئی حقیقت ہو سکتی ہے تو دلیل کے ساتھ کسی بات کو نہ ماننا اور زیادہ حقیقت ہے"۔

عالم دین نے مجھے دیکھا اور کہا ـــ "معاذ اللہ، شیطان بھی کس کس طرح انسان کو بہکاتا ہے"۔

میں خاموش دیر تک سوچتا رہا کہ "عقل انسانی بھی دنیا میں کتنی بڑی گمراہی ہے"۔

باب الاستفسار

کلیلہ و دمنہ

(جناب سید برہان الدین صاحب مغلپورہ - ہانسی)

کیا آپ مہربانی فرما کر بتا سکتے ہیں کہ کلیلہ دمنہ سب سے پہلے کب اور کس زبان میں لکھی گئی اور پھر کن کن زبانوں میں اس کے ترجمے کئے گئے - میں ایک کتاب ہند قدیم کی ادبیات پر لکھ رہا ہوں اور اس سلسلہ میں مجھے ان معلومات کی ضرورت ہے - ممنون ہونگا -

---

(نگار) اس موضوع پر اسی براکلمین کا لکھا ہوا تفصیلی مقالہ ملاحظہ فرمایئے جو انسائکلوپیڈیا آف اسلام میں شائع ہوا ہے - مختصراً میں عرض کئے دیتا ہوں -

یہ کتاب سب سے پہلے سنسکرت زبان میں لکھی گئی اور کلیلہ - دمنہ دونوں بگڑی ہوئی صورتیں ہیں اصل سنسکرت الفاظ کرٹکا اور دمنکا کی (یہ نام تھے دو گیدڑوں کے) - سُریانی زبان میں جو ترجمہ ہوا ہے اس میں یہ دونوں نام کلیلاگ اور دمناگ ہو گئے — سنسکرت سے پہلا ترجمہ پہلوی زبان میں ہوا، اس کے بعد عربی میں اور پھر اسلامی و عیسوی ادبیات میں ہر جگہ یہ کتاب مشہور ہو کر مختلف زبانوں میں منتقل ہوئی -

یہ کتاب سب سے پہلے سنسکرت زبان میں بمقام کشمیر سنہ ۳۰۰ء میں لکھی گئی تھی - اس کا مصنف کوئی وشنو ئی برہمن تھا جس کا نام اب تک متحقق نہیں ہو سکا - یہ کتاب امراء و شاہزادگان کی تعلیم و تربیت کے لئے لکھی گئی تھی اور جانوروں کے فرضی قصوں کے ذریعہ سے اصول جہانبانی بتانا اس کتاب کا اصلی مقصود تھا - سنسکرت کی دو مشہور کتابیں تنترا خیایکا اور پنچ تانترا، اسی کتاب کی دو مختلف صورتیں ہیں -

پنچ تانترا کا پہلوی زبان میں سب سے پہلا ترجمہ خسرو انوشیرواں (۵۳۱ - ۵۷۹ء) کے زمانہ میں ہوا - مترجم کا نام بُرزوی تھا، یہ دربار کا طبیب تھا اور محض اسی کام کے لئے ہندوستان بھیجا گیا تھا - بُرزوی نے اس میں چند اور قصوں کا بھی اضافہ کر دیا جو ہندوستان ہی میں اس نے سنے تھے - اس کا دیباچہ خود اس نے لکھا تھا -

برُزوی کا یہ ترجمہ معدوم ہو چکا ہے لیکن اس سے جو ترجمہ سریانی زبان میں سنہ ۵۷۰ء کے قریب بیر ددوت بُود نے کیا تھا اُس کا ایک نسخہ ضرور اب بھی پیرس میں پایا جاتا ہے۔

اس کے تین صدی بعد عبداللہ بن المقفع نے برُزوی کے ترجمہ کو عربی میں منتقل کیا اور تھوڑا بہت اضافہ بھی اپنی طرف سے کیا۔ ابن المقفع کا یہ ترجمہ حقیقتاً ادبی خوبیوں اور انشاء عالیہ کا بہترین نمونہ تھا جسے صرف خواص کے طبقہ تک محدود رہنا چاہیے تھا؛ لیکن موضوع اس قدر عام پسند تھا کہ ہر طبقہ و جماعت میں اسکی شہرت ہو گئی اور نقل و روایت کی عمومیت نے اس کو بڑی حد تک غارت کر دیا۔ چنانچہ اس وقت عربی زبان میں جو ترجمے اس کے پائے جاتے ہیں، ان کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ ابن مقفع کے اصل نسخہ سے کتنا انحراف ان میں کیا گیا ہے۔

ابن مقفع کا ترجمہ تین مرتبہ عربی نظم میں لایا گیا۔ پہلی مرتبہ تو ابن مقفع کے ہمعصر ابان اللاحقی نے کیا جواب ناپید ہے۔ دوبارہ سنہ ۱۱۰۰ء میں ابن الہباریہ نے کیا، تیسری بار دُرّ الحکم کے نام سے عبدالمومن نے سنہ ۱۲۴۲ء میں کیا۔

دسویں یا گیارہویں صدی میں ابن مقفع کے ترجمہ کو ایک سریانی زبان کے عالم نے سریانی میں منتقل کیا ہر چند اس نے اس میں عیسوی رنگ پیدا کیا اور ترجمہ میں بھی غلطیاں کیں، لیکن چونکہ اس نے ایسے نسخہ سے ترجمہ کیا تھا جو ابن مقفع سے قریب تر عہد کا تھا، اس لئے اس کی اہمیت نقادان فن کے نزدیک بہت ہے۔

شاہنامہ میں فردوسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن المقفع کا ترجمہ پہلوی زبان میں نصر بن احمد سامانی کے عہد میں (۹۱۴-۹۴۳ء) وزیر بلعمی کے حکم سے کیا گیا تھا؛ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ختم نہیں ہو سکا۔ اسی بادشاہ کے حکم سے رودکی نے بھی اس کو نظم کیا جسکے صرف سولہ شعر اسدی کے لغات فرس میں نظر آتے ہیں۔

ابن مقفع کا ترجمہ فارسی نثر میں سنہ ۱۱۴۲ء کے بعد نظام الدین ابو المعالی نصر اللہ نے کیا تھا اور بہرام شاہ فرمانروائے غزنہ کے نام معنون کیا گیا تھا۔ اسی ترجمہ کو احمد بن محمود الطوسی قانعی نے نظم کر کے سلطان عزالدین کیکاؤس (۱۲۴۴ - ۱۲۶۳ء) کی خدمت میں پیش کیا۔ اور پھر نظر ثانی کے بعد ملا حسین واعظ کاشفی (سنہ ۱۵۰۴ء) نے جو حسین بیقرا (والی ہرات) کا واعظِ دربار تھا وزیر احمد سہیلی کے نام پر انوار سہیلی کے عنوان سے پیش کیا۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اس کا ترجمہ دنیا کی تمام زبانوں میں کیا گیا۔ لیکن چونکہ انوار سہیلی کی عبارت و انشاء بہت دقیق و مشکل تھی اس لئے شہنشاہ اکبر نے ابوالفضل کو

سور کیا کہ وہ دوبارہ اس کو مرتب کرے، چنانچہ عیار دانش کے نام سے ۱۵۷۸ء میں دوسرا ترجمہ پیش کیا گیا
سا میں ابن مقفع اور بُرزوی کے اصل دیباچے بھی شامل تھے، مگر یہ کتاب شایع نہ ہوسکی۔

ترکی زبان میں بھی ابن مقفع کا ترجمہ دوبار منتقل کیا گیا لیکن نصر اللہ کے ترجمۂ فارسی سے - قدیم
کی میں بھی ایک شخص مسعود نامی نے اس کو منتقل کیا - اس کے بعد یہ منظوم بھی ہوا اور سلطان مراد اول کے
امنے پیش کیا گیا - حال کی ترکی نثر میں بھی اس کو منتقل کیا گیا اور غالباً ۱۵۴۰ء سے کچھ زمانہ قبل علی بن صالح
علی چلپی نے انوار سہیلی کا ترجمہ مقفیٰ عبارت (ترکی) میں کیا اور ہمایوں نامہ کے نام سے سلطان سلیمان اول
سامنے پیش کیا - اسی ہمایوں نامہ کا ترجمہ بعد کو فرانسیسی، جاوی، ملائی زبانوں میں ہوا، کہا جاتا ہے
ہمایوں نامہ بہ لحاظ حسن انشار کے انوار سہیلی سے بدرجہا بہتر تھا۔

ابن المقفع کی کتاب کا ترجمہ عربی سے ترکی میں عبد الغلام فیض خان اوغلو نے بھی کیا تھا جو ۱۸۸۹ء میں
نام قازان شایع ہوا۔

مغولی زبان میں بھی ملک افتخار الدین محمد بن ابی نصر نے اس کا ترجمہ کیا، لیکن اب وہ معدوم ہے، اسی
ح جشی زبان کا ترجمہ بھی اب نایاب ہے۔

عبرانی میں اس کا ترجمہ ربی جوئیل نے کیا تھا اور ابن مقفع کے نہایت قدیم نسخہ کو سامنے رکھ کر کیا گیا تھا - اس کے
ربی جوئیل کا ترجمہ لاطینی اور ہسپانی زبانوں میں کیا گیا - گیارہویں صدی کے اخیر میں یونانی زبان میں بھی
ں کا ترجمہ کیا گیا لیکن براہ راست ابن مقفع کے نسخہ سے۔

عہد اکبری میں مفرح القلوب کے نام سے تاج الدین نے جو ترجمہ پیش کیا وہ پنچ تانترا کے ترجمۂ سنسکرت
و پادیشا سے کیا گیا تھا - اسی مفرح القلوب کو میر بہادر علی حسینی نے ۱۸۰۳ء میں ہندوستانی یا اردو زبان
ں منتقل کیا - اس کے ایک سال بعد گل کرائسٹ نے اسی کو اخلاق ہندی کے نام سے مرتب کر کے پیش کیا۔

ملائی زبان میں جو کتاب "حکایات کلیلہ و دمنہ" کے نام سے پائی جاتی ہے وہ ابن مقفع کی کتاب
ر پنچ تانترا کے تامیلی ترجمہ دونوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی۔

ابن مقفع کی کتاب کو سامنے رکھ کر تین اس طرح کی اور کتابیں لکھنے کی تین بار کوشش کی گئی - لیکن
میابی نہ ہوئی - حقیقت یہ ہے کہ کلیلہ و دمنہ دنیا کی ان چند کتابوں میں سے ہے جو شہرت و قبول کے
تائی درجہ تک پہونچیں اور کرۂ ارض کی تمام زبانوں میں جن کا ترجمہ ہوا۔

یہاں وہاں سے

لغزش قدم:۔

شوبان، ایک تاجر کے دفتر میں ملازم ہے۔ آدمی خوش قد، خوش ادا ہے اور ان تمام خصوصیات سے آراستہ جو ایک عورت کو اپنی طرف مائل کر سکتی ہیں۔

ایک شام حسب معمول دفتر سے نکل کر جلدی جلدی چلنے لگا تاکہ اسٹیشن پہونچکر سب سے پہلی گاڑی پر سوار ہو کر اپنی قیام گاہ کو واپس جا سکے۔

ٹھیک اس وقت جبکہ وہ اسٹیشن کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا ایک نوجوان لڑکی زینہ سے پھسلی اور اُس نے زور سے چیخ ماری۔ شوبان نے بڑھکر اسے سنبھالا اور پوچھا کہ چوٹ تو نہیں آئی اس نے کہا "نہیں" اور اُس کے بازو پر اپنے جسم کا بوجھ ڈالے ہوئے ریل کے ایک کمرہ میں بیٹھ گئی۔

رفتہ رفتہ یہ مراسم بڑھتے گئے اور آخرکار دونوں نے شادی کا عہد و پیمان کرکے ایک ہی جگہ زندگی بسر کرنی شروع کردی —— یہ لڑکی کپڑا سینے کے کارخانے میں ملازم تھی کچھ دن گزرنے کے بعد شوبان نے محسوس کیا کہ باہم تعلقات محبت کم ہوتے جاتے ہیں اور لوسی نے بھی شوبان کی بے اعتنائی کو محسوس کرکے آخرکار ایک دن اس سے صاف صاف پوچھا کہ یہ کیا بات ہے۔ شوبان نے جواب دیا "واقعہ یہ ہے کہ میں جس جذبہ کو محبت سمجھتا تھا وہ محبت کا جذبہ نہ تھا بلکہ کچھ اور تھا"۔ لوسی نے یہ سنکر فوراً اس کے کمرہ سے اپنا سامان سنبھالا تاکہ اپنی ماں کے گھر جا کر رہے۔

وہ اپنا سامان لئے اسٹیشن کی سیڑھی سے گزر رہی تھی کہ اُس کا قدم پھسلا اور ایک اور نوجوان نے بڑھکر اُسے سنبھالا اور نہایت الفت و ہمدردی سے پوچھا کہ "چوٹ تو نہیں آئی"۔

اس نے کہا "نہیں" اور اس کے بازو پر اپنے جسم کا بوجھ ڈالے ہوئے ریل کے ایک کمرہ میں بیٹھ گئی۔

یہ بھی کوئی بات تھی:۔

لوسیا، ۱۸ سال کی نوجوان لڑکی تھی اور کافی قبول صورت۔ لیکن نہایت ہی خاموش و متین بلکہ ایک

حد تک مغرور و متکبر تھی۔ نہ کسی سے بات کرتی تھی اور نہ کسی بزم میں آزادی کے ساتھ شریک ہوتی۔ اسکے والدین نے بہت نصیحت کی کہ یہ عادت خراب ہے اور اس کے مستقبل کو تباہ کر دینے والی ہے لیکن اسپر کوئی اثر نہ ہوا۔

اتفاقاً ایک جلسۂ رقص میں اس خاندان کو جانا پڑا۔ لوئیسا کے والدین بہت متفکر تھے اور ڈر رہے تھے کہ سوسائٹی میں لوئیسا پر ہر طرف سے انگلیاں اٹھیں گی اور انھیں شرمندگی اُٹھانا پڑے گی، لیکن دفعتہً ایک شخص اس جلسہ میں سے اُٹھ کر آیا اور لوئیسا سے چند باتیں کرنے کے بعد اس کو اپنے ساتھ رقص کے لئے لے گیا۔ لوئیسا بہت مسرور نظر آتی تھی اور مسکرا رہی تھی!

لوئیسا کا مسکرانا اس کے والدین کے نزدیک دنیا کا عجیب و غریب واقعہ تھا۔ اس کی ماں نے اپنے شوہر سے کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ لوئیسا تو فرشتہ ہے اس میں فرشتے کے سے اخلاق ہیں، لیکن اس وقت اس کا کوئی سمجھنے والا نہ ملا تھا"۔ شوہر نے کہا۔ "تم سچ کہتی ہو، آج مجھے کتنی مسرت ہے کہ لوئیسا کی حقیقت سے آخر کار پردہ اُٹھ کر رہا"۔

جب رقص ختم ہوا تو وہ اجنبی لوئیسا کو لیکر آیا اور اُس کے والدین سے کہا کہ "اس لڑکی میں تو فرشتوں کے سے اخلاق ہیں"

ماں نے کہا۔ "یہ سب آپ ہی کی عنایت ہے کہ لوئیسا میں دفعتہً ایسا عجیب و غریب انقلاب پیدا ہوا، حقیقت یہ ہے کہ آپ اس فن کے بڑے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔

اجنبی نے کہا۔ "مجھے آپ کی بیٹی کو رام کرنے میں مطلق کوئی زحمت نہیں ہوئی، اور نہ مجھے اس میں کوئی حیرت کی بات معلوم ہوتی ہے"

ماں — "اس میں شک نہیں کہ تم اس فن کے بڑے جاننے والے ہو ایک ہی نگاہ میں لوئیسا کی فطرت بدل دی —"

اجنبی — "یہ بھی کوئی بات تھی، میں روز یہی کرتا ہوں اور یہی میرا پیشہ ہے"

یہ سنکر وہ حیران ہوئے اور اُس سے پوچھا "آپ کیا کام کرتے ہیں"

اس نے نہایت خشک منھ سے جواب دیا کہ "میں جانوروں کے سدھانے کا کام کرتا ہوں"

اپنی ڈاک کا انتظام کیجیئے یہاں سے ہر خریدار کے نام رسالہ نگار پابندی وقت کے ساتھ کئی بار فہرست خریداران کا مقابلہ کرنے کے بعد روانہ کیا جاتا ہے۔ اس لئے اگر رسالہ کسی صاحب کو نہیں پہونچتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اُن کی ڈاک کا انتظام درست نہیں۔ مینجر نگار لکھنؤ

انسان اور کائنات

مسکرائی نشاط کی دیوی
لی عروسِ سحر نے انگڑائی
خونِ تازہ رگوں میں دوڑ گیا
پیکرِ زندگی میں جان آئی
چھٹ گئے رات کے سیہ بادل
برقِ انوارِ صبح لہرائی
ہلکی ہلکی تجلیوں کا سماں
حسنِ پنہاں کی جلوہ آرائی
دھیمی دھیمی صدائے موجِ نسیم
سازِ فطرت کی نغمہ پیرائی
سبز پودوں کی دلپذیر لہک
زندگی، روح، کیف، برنائی
سرد چشموں کا دلفریب خرام
تازگی، حسن، عیش، رعنائی
کو بہ کو جاں نواز و نشۂ فروش
عشرتِ دورِ جامِ صہبائی
چہچہے طائروں کے روح فزا
چمن آرا گلوں کی زیبائی
پتے پتے میں دفترِ اسرار
ذرے ذرے میں درسِ بینائی

دیکھ کر یہ بہارِ جلوۂ رنگ
تازہ ہونے لگی فسردہ امنگ

میں نے گیتی سے یہ سوال کیا
اے سراپا جمال و عشرت و ناز
جو ہماری نظر میں ہے انجام
ہے وہی تیرا نقطۂ آغاز
کون پیتا خوشی سے جامِ فنا
زندگانی ہے اک ترا اعجاز
جانفزا تیری شام کا منظر
دلکشا تیری صبح کا انداز
کس نے پایا ترے کمال کا بھید
کس نے سمجھا ترے زوال کا راز

مہرِ رخشاں ترے چمن کا گلاب　　ماہِ روشن تری جبیں کا طراز
ہے تری سطح کس قدر ہموار　　بہ ہمہ وسعتِ نشیب و فراز
پھر مجھی پر ستم ہیں کیوں اتنے　　دلشکن، صبر سوز، روح گداز
میری ہستی بھی کوئی ہستی ہے　　نہ حقیقت کہیں جسے نہ مجاز
ہوں رہینِ غمِ شکستہ پری　　نہ تحمل، نہ طاقتِ پرواز

سن کے میری زبان سے یہ سخن
پڑگئی دہر کی جبیں پہ شکن

پہلے دیکھا نگاہِ حیرت سے　　مجھکو دنیا نے پھر دیا یہ جواب
اس قدر سطح بیں، خدا کی پناہ　　باوجود نگاہ رہنِ حجاب!!
تیری مے سے ملا فروغ مجھے　　میں ہوں اک ورنہ، خاکدانِ خراب
ذرہ ذرہ ترا مہ و خورشید　　میرے چہرے پہ تیرگی کا نقاب
خاک سے تیرہ تر ہے میری نمود　　زہر سے تلخ تر ہے میری شراب
میں سراپا ملالِ تشنہ لبی　　تیرے ساغر میں لرزشِ مےِ ناب
تجھ سے رخشاں مری فضائے جمال　　تجھ سے روشن مری جبینِ شباب
میں طرب ناشناس، تو سرشار　　میں خذف تو ہے گوہرِ نایاب
شام تیری مسرتوں کا چمن　　صبح تیری تجلیوں کا شباب
قلب تیرا امینِ سرِ ازل　　اور میں کم سواد محفلِ خواب

جا رہا ہے کدھر خیال ترا
نازِ کونین ہے جمال ترا

علی اختر (حیدرآباد دکن)

زندگی

دل کی دھڑکن میں دل کی حدت میں
شعلہ ہائے جنوں کی شدت میں
روح کی حشر خیز آہوں میں
موت کی آتشیں نگاہوں میں
زندگی کا شرار لرزاں ہے
جذبۂ بیقرار لرزاں ہے
برق سوزاں کا التہاب ہے کیا
موج دریا کا اضطراب ہے کیا
بزم انجم کی روشنی کیا ہے
چاند کی مست چاندنی کیا ہے
جوشِ احساس کامرانی ہے
یعنی اُٹھتی ہوئی جوانی ہے
مہر تاباں کی تیز کرنوں کا
آگ کے حشر خیز شعلوں کا
وحشت آلود برق و باراں کا
خشمگیں اور تند طوفاں کا
زندگی پر اثر نہیں ہوتا
خوف کا واں گذر نہیں ہوتا

زندگی آتشیں نواؤں کا
زندگی سرمدی صداؤں کا
ایک وحشت نواز پیکر ہے
شعلہ افشاں مہیب اژدر ہے
زندگی جب زباں ہلاتی ہے
موت کی روح کانپ جاتی ہے
زندگی ایک راز ہے یکسر
موت سے بے نیاز ہے یکسر

باقی صدیقی (سہام)

شعلۂ سینا

اعجازِ تجلّی ہے کہ نیرنگِ تماشا
آئینۂ کثرت میں ہے اک جوہرِ یکتا

دل حسن کے پرتو سے ہوا حسنِ سراپا
پہلو میں لئے پھرتے ہیں ہم شعلۂ سینا

پیدا تو کرے جوشِ طلب ذوقِ تماشا
ہے خاک کے ہر ذرہ میں اک جلوۂ رعنا

ہوں سرخوشِ کیفیتِ غمخانۂ ہستی
ہیں میرے لئے دیدہ و دل ساغر و مینا

بیگانۂ کونین ہے دیوانۂ الفت
اللہ ری رعنائی فردوسِ تمنا

ساقی کی نظر تھی کہ مئے ہوش رُبا تھی
باقی ہے غمِ دوش، نہ اندیشۂ فردا

دیتی تھی جلا عشق سے آئینۂ دل کو
ہوتا ہے کہیں داغِ جبیں دیدۂ بینا

ملتے نہیں وہ مجھ سے مگر ہوں میں نظر میں
ناکام نہیں عشق میں، ناکام تمنا

کس رنگ میں ظاہر نہ ہوئے حُسن کے جلوے
یہ مان لیا عشق ہی ہر حال میں رسوا

اوروں کا تو کیا ذکر ہے کھو جاتے ہیں ہم بھی
کوکب وہ نظر آتے ہیں ہر بزم میں تنہا

کوکب شاہجہانپوری

رُوَدادِ عمل

سیکڑوں تاریک راتوں کا سکوتِ حشر خیز
رہ چکا ہے مضطرب آنکھوں سے سرگرمِ ستیز

برق کڑکی، قہر ٹوٹا، آسماں تھرا چکے
موت کے بادل مرے سر پر بہت منڈلا چکے

روند ڈالا جراءت بیباک نے آلام کو
کر دیا تبدیل طرزِ گردشِ ایّام کو

دل کی وحشت خیزیوں نے حدِ امکاں توڑ دی
نغمۂ تقدیر سے تدبیر کی لے جوڑ دی

قہرمانی قوتیں مغلوب ہو کر رہ گئیں
میرے استغنا کی طوفاں خیز رو میں بہہ گئیں

عزمِ محکم کی قسم! جب طیش میں آتا ہوں میں
برق بن کر موت کے خرمن پہ چھا جاتا ہوں میں

خوگرِ غمہائے دوراں ہوں ڈروں کس بات سے
حوصلہ مضبوط ہوتا ہے مرا آفات سے

بجلیوں کا سوز خوابیدہ ہے میری ساز میں
التہابِ زیست لرزاں ہے مری آواز میں

ناز کرتا ہے مری ہمّت پہ اقبالِ حیات
میرے نورِ عزم سے تاباں ہیں اعمالِ حیات

عدمؔ

غزلیات

آسی الدنی :-

نہ خوشی کی خوشی نہ رنج کا ہوش — زندگی موت سے ہے دوش بدوش
شوق بے صبر دل سراپا جوش — یہ بھی ظالم ہے وہ بھی ایذا کوش
ضبط غم کا نہیں ہے کچھ حاصل — کون سنتا ہے نغمۂ خاموش
رنج بیمائگی بڑی شے ہے — قطرہ قطرہ ہے بحر در آغوش
میری حسرت خروش بیمعنی — دل کے ارمان محفل خاموش
اُن سے پوچھے کوئی حقیقت حال — کہتے کہتے جو رہ گئے خاموش
تیرے پردے نے یہ اثر ڈالا کہ — ہوتا جاتا ہے اک جہاں روپوش
ہو چلا ہے جمود سا طاری — پھر پلا جام بادۂ سرجوش
منقلب ہے جہان جانبازی — بیخودی ہے نوید آمد ہوش
غنچے چٹکے کریں گریباں چاک — مل گیا اب تو اذنِ رخصتِ ہوش

ہر طرف سے بہاریں آسی
آ رہی ہے صدائے نوشا نوش

شاد صابری :-

روز ازل جبکہ سازِ جلوۂ کامل بنا — ایک نغمہ تھا کہ پردے سے نکل کر دل بنا
سوزِ غم سے ہے نظام زینت بزم جہاں — شعلۂ الفت بھڑک کر رونق محفل بنا
اللہ اللہ جوش وحشت کی اثر اندازیاں — ہر قدم مٹ مٹ کے میرا جادۂ منزل بنا
کس نگاہِ ناز سے دیکھا گیا میری طرف — گر کے نظروں سے تری میں رونق محفل بنا
دل کو دے اک زخم پنہانی نگاہ ناز سے — میں کسی قابل نہیں ہوں تو کسی قابل بنا

روح گرداب فنا میں آ نہیں سکتی کبھی
جو حباب بحر ٹوٹا، موجۂ ساحل بنا

کس قدر صبر آزما تھی منزل راہِ وفا
میرا اک اک گام نقش سعیٔ لاحاصل بنا

طرحِ انداز محبت تھیں نگاہیں قیس کی
جو بگولہ دشت میں اُٹھا وہ اک محمل بنا

غایت لطف و کرم سے کام لی ای حسن دوست
شاد کے ذوق نظر کو پردۂ حاصل بنا

عابد شاہجہانپوری:—

جام آشنا نظر ہوئی ہر بادہ خوار کی
ڈوبی ہوئی اثر میں فضا تھی بہار کی

آواز بازگشت کو سمجھا تری صدا
یہ حد تھی اضطراب دلِ بیقرار کی

ایدل وداع ہوش کا پیغام آگیا
رعنائیاں فضا میں ہیں جوش بہار کی

جب سامنا ہوا کوئی شکوہ نہیں رہا
تاثیر دیکھئے نگہ شرمسار کی

جس ذرہ پر نگاہ پڑی کوئے یار میں
تصویر تھی کھنچی ہوئی جوش بہار کی

اب اُٹھ چکی نگاہِ طلب جانب حرم
جزو جبیں ہے خاک ترے رہگذار کی

ہنگامۂ بہار ہے نظروں کے سامنے
مشکل اب کہاں سکونِ دلِ بیقرار کی

اب وہ نگاہِ شوخ ہے کیوں گردش آشنا
دنیا تو مٹ چکی ہے شکیب و قرار کی

ہر ہر نفس ہے عشق میں اک عالم جنوں
پابندیاں اب اُٹھ گئیں جوش بہار کی

دنیائے اتیاز رہی حدِ ہوش تک
اب کچھ خبر نہیں مجھے انجام کار کی

عابد جنون عشق کا شکوہ نہیں مجھے
حدت تو کوئی ہو جوشِ دلِ بیقرار کی

فرخ بنارسی:—

پہلے حجاب دیدۂ حیراں اُٹھائیے
پھر حسنِ دل فروز کا احساں اُٹھائیے

اے جوش سجدۂ درِ جاناں ذرا ٹھہر
دل کہہ رہا ہے منتِ درماں اُٹھائیے

کب تک علاج دردِ محبت کا کیجئے
کب تک نگاہِ ناز کا احساں اُٹھائیے

آساں نہیں ہے حسن سے دل کا معاملہ
کچھ فائدہ اگر ہو تو نقصاں اُٹھائیے

کیوں اعتمادِ عشق کو برباد کیجئے
کیوں پردۂ تبسم پنہاں اُٹھائیے

کیوں منھ قفس کا دیکھئے فصل بہار میں
کیوں نالے کر کے سر پہ گلستاں اُٹھائیے

کیوں کیجئے آزمائشِ حسنِ فریب کار — کیوں اعتبارِ دیدۂ حیراں اُٹھایئے
کیوں گھر میں بیٹھ کر درودیوار دیکھئے — جوشِ جنوں میں لطفِ بیاباں اُٹھایئے
جب دردِ لادوا ہو تو بے سود ہے دوا — کیوں تہمت کشاکشِ درماں اُٹھایئے
سازِ جنوں سے چھیڑیئے اک نغمۂ نشاط — رنگینی بہار کا طوفاں اُٹھایئے

فرخ یہی ہے عشق کا حاصل کہ تا بہ مرگ
بارِ غمِ تغافلِ جاناں اُٹھایئے

ناطق گلاؤٹھوی :-

کیا ارادے ہیں وحشتِ دل کے — کس سے ملنا ہے خاک میں مل کے
اے دل شکوہ سنج کیا گذری — کس لئے ہونٹ رہ گئے سل کے
ہو گئی گردِ راہ غمِ لیلےٰ — چھوڑ مجنوں خیال محمل کے
مٹتے جاتے ہیں راہ عمر میں دوست — مل رہے ہیں نشان منزل کے
بحرِ غم بے نیازِ طوفاں ہیں — ڈوبنے والے گردِ ساحل کے
نہ رہے جب اُمید آسانی — دن کٹیں کس طرح سے مشکل کے

چھوڑ ناطق فضائے بزمِ شکست
لے یہ ٹکڑے سنبھال لے دل کے

محمود الہ آبادی :-

نہ کیونکر اس ستم آرا سے ہم وفا کرتے — کوئی بتائے ہم اہلِ وفا تھے کیا کرتے
تمام نغمۂ الفت تھی ہر صدا اُن کی — فضا خموش جو ہوتی تو ہم سنا کرتے
وہ حسن پیکرِ انساں وہ کیف برق نگاہ — صنم جو دیکھتے اس کو خدا خدا کرتے

ربابِ عشق تھا خاموش دہر میں محمود
وگرنہ نغمۂ الفت کو ہم سنا کرتے

معلومات واقتباسات

روس میں عورت کی موجودہ زندگی

سنہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روس میں سب سے زیادہ مہتم بالشان تبدیلی جس طبقہ میں ہوئی ہے، وہ عورتوں کا طبقہ ہے۔ کوئی دقیقہ کوشش کا اُٹھا نہیں رکھا گیا کہ مرد عورت دونوں میں حقیقی مساوات پیدا ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مساوات اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک عورت اقتصاد معاش کے باب میں مرد کی محتاج نہ رہے اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ صنعت و تجارت، تعلیم و حرفت، زراعت و فلاحت الغرض زندگی کے تمام مدارج و منازل میں عورت مرد کے دوش بدوش کام کرے۔ چنانچہ روس میں اب اسی اصول پر عمل ہو رہا ہے اور عورت کے لئے ترقی کا میدان اسی طرح کھلا ہوا ہے جیسا مرد کے سامنے۔

اس سلسلہ میں بالشویک حکومت کے سامنے سب سے زیادہ اہم سوال شادی شدہ عورتوں کا تھا۔ وہ لڑکیاں یا عورتیں جن کی شادی نہیں ہوئی وہ تو خیر آزاد ہیں اور مردوں کے برابر کام کر سکتی ہیں، لیکن جن کی شادی ہو چکی ہے اور جن کو اپنے اوقات کا بڑا حصہ اولاد کی پرورش میں صرف کرنا پڑتا ہے وہ کیونکر اس مساوات کی برکت حاصل کر تی تھیں۔ اس کا جو انتظام بالشویک حکومت نے کیا ہے عجیب و غریب ہے۔

شادی شدہ عورتوں کے لئے بالشویک حکومت نے کھانا پکانے، کھانا کھانے کپڑا دھونے، بچوں کی پرورش اور ابتدائی تعلیم کے لئے سرکاری ادارے قائم کر دئے ہیں۔ اور بچہ جننے کے بعد ایک عورت ان تمام فرائض سے سبکدوش ہو جاتی ہے۔ گاؤں اور قصبات میں اس نوع کے ادارے صنعتی کارخانوں اور زرعی اداروں کے ساتھ ساتھ قائم کئے گئے ہیں۔

جمہوریۂ سوویٹ کا جو سب سے بڑا صوبہ ہے وہاں بچوں کی پرورش گاہیں جو کارخانوں سے متعلق ہیں ایک سال کے اندر ایک لاکھ سے ایک لاکھ ۸۰ ہزار تک پہونچ گئی ہیں۔

کولکھوزی میں کسانوں کے ۵۰ لاکھ بچے ان اداروں میں پرورش پا رہے ہیں۔ اس سال کے آخر تک ۳۵ لاکھ بچوں کے لئے اور انتظام ہو سکے گا۔

گرشتہ سال دو کرور پونڈ ان اداروں کے قیام پر صرف کیا گیا اور ۵ کرور پونڈ بچوں کی پرورش پر۔ اُمید کی جاتی ہے کہ سنہ ۳۲ء میں صنعتی رقبوں کی آبادی کے ۷۳ فی صدی بچے ان اداروں میں آ جائیں گے

یعنی روس کی کل آبادی کے لحاظ سے ۵۸ فی صدی بچے ان اداروں میں داخل ہو سکیں گے - اس طریق کار کی وسعت و مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چار سال قبل ۱۹۲۸ء میں صرف ۲۸ فی صدی بچوں کی گنجائش ان اداروں میں تھی - لیکن اب ۷۳ فی صدی تک پہونچ گئی ہے -

ان اداروں کے قیام نے روس کی عورت کو امور خانہ داری اور تربیت اطفال کے بار سے سبکدوش کر کے مردوں کے دوش بدوش تمام علمی وصنعتی تجارتی وزرعی کاموں میں مشغول ہونے کے لئے آزاد کر دیا ہے -

آٹھ سال قبل روس میں صرف ۲۳ لاکھ ۴۹ ہزار عورتیں اجرت پر کام کرتی تھیں لیکن اس وقت ۶۰ لاکھ ہیں اور اختتام سال تک ۱۵ لاکھ کے اضافہ کی اور توقع کی جاتی ہے - روس میں عورت و مرد دونوں کی اجرت بالکل برابر رکھی گئی ہے -

ان عورتوں کو وضع حمل سے آٹھ ہفتہ قبل اور آٹھ ہفتہ بعد تک پوری اُجرت پر چھٹی دیدیجاتی ہے، لیکن جو عورتیں دماغی کام کرتی ہیں ان کو ۶ ہفتہ قبل اور چھ ہفتہ بعد کی رخصت ملتی ہے - اسی کے ساتھ بچے کے کپڑوں وغیرہ کے لئے کچھ الاؤنس بھی مقرر کر دیا جاتا ہے - اور طبی امداد بالکل مفت دیجاتی ہے -

اُن کارخانوں میں جہاں پہلے عورت نہایت ہی معمولی معمولی خدمت انجام دیتی تھی، وہیں اب وہ ماہرانہ حیثیت سے کام کرتی نظر آتی ہے اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ عورت کسی بات میں مرد سے کم نہیں ہے - عورتیں البتہ ان کاموں سے ضرور باز رکھی جاتی ہیں جو اُن کے نسوانی اعضا کو صدمہ پہونچانے والے ہیں -

روسی عورتیں نظم حکومت میں بھی عملی حصہ لے رہی ہیں چنانچہ اس وقت وہاں ۳ لاکھ عورتیں مختلف سرکاری کمیٹیوں میں ممبر کی حیثیت سے اور ۵ لاکھ متعدد محکموں میں عاملانہ حیثیت سے کام کر رہی ہیں - سوویٹ ٹریڈ یونین میں ۴۵ لاکھ عورتیں شریک ہیں -

ان میں تعلیم برقی سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے - گزشتہ تین سال میں ایک کرور ۵۰ لاکھ جاہل عورتوں کو ابتدائی لکھنا پڑھنا سکھایا گیا اور صنعتی تعلیم میں ان کی تعداد بمقابلہ ۱۹۲۹ء کے ۲۸ فیصدی سے ۴۷ فیصدی تک پہونچ گئی -

یونیورسٹیوں میں عورتوں کی تعداد ۱۹۳۰ء میں ۲۷ فیصدی تھی لیکن ۱۹۳۱ء میں ۴۰ فیصدی سے بڑھ گئی

ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ مختلف تعلیمی شعبوں میں وہ کس نسبت سے آگے بڑھ رہی ہیں -

ڈاکٹری	۷۵	فی صدی
محکمۂ تعلیم	۵۱	فی صدی
صنعتی تعلیم	۳۹	فی صدی
تحقیقات علمیہ	۲۹	فی صدی

ابتدائی و ثانوی تعلیم میں اس وقت ۶۷ فی صدی عورتیں درس و تدریس میں مشغول نظر آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت روس ہی ایک ملک ایسا ہے جس نے نظام تمدن کی ترقی میں عورت کی اہمیت کا صحیح اندازہ کیا اور اس کو دماغی و جسمانی دونوں طرح کی مکمل آزادی سے آشنا کیا۔

ایک گم شدہ جزیرے کی جستجو

امریکہ کے سمندروں میں خط نصف النہار سے شمال پر ایک جزیرہ سارآن پایا جاتا تھا جو اب بالکل نظر نہیں آتا۔ ہر چند نقشوں میں اس کا نام اب بھی پایا جاتا ہوگا، مگر وہ خود کہیں نہیں ہے۔ چنانچہ امریکہ نے اپنے بحر پیسفک کے بیڑے کو حکم دیا کہ اس جزیرہ کی جستجو کی جائے، دوسری طرف جرمنی بھی اس کے پالینے کی فکریں کر رہا ہے۔

اس جزیرہ کی اہمیت فی الحال اس لئے بڑھ گئی ہے کہ یہی ایک چھوٹا سا جزیرہ ایسا ہے جہاں سے سنہ ۳۷ء میں واقع ہونے والے سورج گرہن کا پورا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ اور آس پاس کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں کوئی رصدگاہ قائم ہو سکے۔

سال رواں میں جو سورج گرہن ہونے والا ہے اور جسکے دیکھنے کے لئے ہزاروں ماہرین فلکیات نیوانگلینڈ پہنچ رہے ہیں صرف ڈیڑھ منٹ رہیگا، لیکن سنہ ۳۷ء کا گرہن سات منٹ $\frac{۳}{۵}$ سکنڈ تک قائم رہیگا۔ گرہن پڑنے کی زیادہ سے زیادہ مدت سات منٹ ۳۰ سکنڈ ہو سکتی ہے، اس لئے سنہ ۳۷ء کا سورج گرہن ایک ایسا موقع ماہرین فلکیات کے لئے مشکل ہی سے پھر دوبارہ نصیب ہو سکتا ہے۔

اہل جرمن جن کو فلکیات کا بڑا شوق ہے بہت متمنی ہیں کہ اُن کو یہ جزیرہ مل جائے اور وہ مخصوص طور پر گرہن کے رصد کا انتظام کریں۔

اَب تک اس میں کامیابی نہیں ہوئی، لیکن اُمید ہے کہ یہ جزیرہ دستیاب ہو جائے گا۔ اگر بہت زیادہ عمیق پانی نے اُسے نہیں چھپالیا اور اگر اس میں کامیابی حاصل ہوگئی تو یہ بھی یقینی ہے کہ یہاں سے جو تصویریں سورج گرہن کی سنہ ۳۷ء میں لی جائیں گی وہ فن کے لحاظ سے نہایت بیش قیمت چیز سمجھی جائیں گی۔

(مولف) معترض نے عجب طرح سے اس شعر کی شرح کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے سمجھا ہی نہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ سوائے معشوق کے اور کس کی شب فرقت ہو سکتی ہے۔ یہ عجیب جملہ ہے۔ معشوق کی شبِ فرقت کیا معنی فرقت معشوق اپنے محل پر کہا جاتا ہے۔ شبِ فرقتِ معشوق نہیں کہا جاتا۔ اور کیا وجہ ہے کہ شب فرقت کو عاشق کی شب فرقت نہ مانا جائے۔ یہاں شاعر کا مطلب یہ ہے کہ ایک میری ہی شب فرقت ایسی ہے جو یہ کہتی ہوئی آئی ہے کہ ہم زمانے کو رنگ نہیں بدلنے دیتے ورنہ اور ایسا دنیا میں کون ہے، یعنی میری برابر کوئی بد نصیب نہیں۔

ریاض۔ کیوں مجھکو جلاتے ہو دم وصل یہ کیا ہے کیوں پھونکتے ہو شمع کو جلنے نہیں دیتے

اعتراض۔ اگر شعر کی خوبیاں لفظی مناسبتوں پر منحصر ہیں تو بہت اچھا شعر ہے۔ اور اگر معانی سے بھی بحث ہے تو اس میں کلام ہے۔ عاشق کے سامنے اگر وصل کے وقت چراغ نہ ہو تو وہ اس حد تک ناگوار نہیں ہو سکتا کہ جس سے عاشق کا جی جل جائے البتہ صرف یہ تماشا دیکھنے میں نہیں آسکتا کہ خلوت کے وقت کیا تغیرات معشوق کے چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں۔

(مولف) یہ شعر یقیناً نہایت رکیک ہے۔

ریاض۔ ہے جان مری کشمکش نزع میں دن رات ارمان تو کیا دم بھی نکلنے نہیں دیتے

اعتراض۔ نزع سے مراد اگر واقعی نزع ہے تو ارمانوں کا ذکر صدائے بے ہنگام ہے۔ صرف "دم نکلنا" کافی ہے تاکہ یہ کشمکش رفع ہو۔ اور اگر نزع مصنوعی نزع ہے یعنی ارمان کے پیچھے نزع کا سا حال ہو گیا ہے تو بیشک ارمانوں کا ذکر لازمی ہے۔ مگر پھر دم نکلنے کی خواہش کرنا معشوق کو دھمکی دینا ہے۔

(مولف) شعر بہت صاف ہے۔ اعتراض لغو ہے۔ صاف مطلب یہ ہے کہ ارمان کی وجہ سے میری حالت حالت نزع سے مشابہ ہے۔ مگر معشوق کوئی توجہ نہیں کرتا۔ نہ مرنے دیتا ہے نہ ارمان نکالتا ہے اس میں اصلی مصنوعی نزع کی بحث چھیڑنا لغویت ہے۔

میر سجاد[۵] و میر تقی میر

میر سجاد۔ کافر بتوں سے داد نہ چاہو کہ یاں کوئی مر جا ستم سے ان کے تو کہتے ہیں حق ہوا

۵؎ میر سجاد خلف میر محمد اعظم اکبر آباد کے رہنے والے تھے مگر دہلی میں قیام تھا۔ ان کے بزرگ (بقیہ فٹ نوٹ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۳۰)

اعتراض میر - اگرچہ باطل باطل ہے لیکن بجائے کافر کے جو پہلے مصرع میں واقع ہے اگر یہاں باطل ہوتا تو وہ صحیح تھا۔

(مولف) بہ لحاظ تناسب الفاظ باطل اچھا ہے - مگر شعر کی صفائی جاتی رہتی ہے - اور وہ برجستگی جو لفظ کافر میں پائی جاتی ہے باطل میں ہرگز نہیں

میر سجاد - میرا جلا ہوا دل کانٹوں کے کب ہے لائق اس آبلہ کو کیوں تم کانٹوں میں اینچتے ہو

اعتراض میر تقی - ہرچند کہ محاورہ میں تصرف جائز نہیں ہے - اس واسطے کہ محاورہ یوں ہے (کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہو) مگر چونکہ شاعر قادر الکلام ہے اس واسطے میں معاف کرتا ہوں۔

(مولف) میر صاحب کی معافی اس بنا پر ہے کہ سجاد قادر الکلام تھے - مگر قادر الکلام سے غلطی ہونا اور بھی زیادہ قابل گرفت ہے - رہا یہ کہ کانٹوں میں کھینچنا - کانٹوں میں اینچنا بھی محاورہ ہے یا نہیں - بعض اس کو جائز رکھتے ہیں - مگر میرے نزدیک درست نہیں کیونکہ کانٹوں میں گھسیٹنا - خوار و ذلیل کرنے کے معنی میں آتا ہے اور ذلت جو گھسیٹنے میں پائی جاتی ہے وہ کھینچنے میں نہیں ہے - اس سے تکلیف کے معنے مفہوم ہو سکتے ہیں - ہاں اگر کوئی شاعر غلط لفظ استعمال کرکے اس کی غلطی کی طرف اشارہ بھی کر دے تو بیشک قابل اعتراض نہیں ہے جیسے بعض لوگوں نے حافظ کے اس شعر میں کہا ہے۔

صلاح کار کجا و من خراب کجا ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

دوسرے مصرع میں قافیہ میں بے ساکن چاہئے تھی مگر مصنف متحرک لایا - اور پہلے مصرع میں اشارہ بھی کر دیا - مرزا غالب کے اس شعر پر اعتراض ہوا ہے

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہوگئے عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

چونکہ صاحب میں حائے حطی مکسور ہے اس واسطے صاحب بفتح حا قابل اعتراض ہے - مگر اس کا یہ جواب دیا گیا کہ یہ مرزا صاحب کا قول نہیں بلکہ دوسرے کے قول کی نقل ہے - یہ لطیفہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا

(بقیہ فٹ نوٹ ملاحظہ ۱۲۹) بڑے بڑے عہدوں پر ملازم تھے - یہ ریختہ کے اچھے شعرا میں تھے - آبرو کے شاگرد تھے - سجاد تخلص کرتے تھے طب میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے ان کے یہاں بالالتزام ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا میر تقی بھی اس میں شریک ہوتے تھے مگر آخر کار کچھ ایسے اسباب پیدا ہوگئے کہ باہم صرف شناسائی کے سوا کوئی خاص تعلق باقی نہ رہا - میر صاحب نے نکات الشعراء میں ان کے ایک شعر پر اعتراضاً اصلاح دی ہے۔

کہ لوگ فردوسی کے اس مصرع کی نسبت کہتے ہیں ؎

فلک گفت احسن ملک گفت زہ

احسن اور ملک کی نسبت کسی نے اعتراض کیا کہ آپ نے شاہنامہ میں یہ التزام کیا ہے کہ الفاظ عربی نہ آنے پائیں گے۔ حالانکہ یہ دونوں عربی ہیں۔ فردوسی نے جواب دیا۔ کہ آن فلک گفت من چہ گفتم۔ یہ بالکل غلط مشہور ہے کہ شاہنامہ میں خالص فارسی زبان کا التزام کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں بہت سے الفاظ عربی وغیرہ کے پائے جاتے ہیں۔

سراج [ل] و رشید

سراج۔ موت نے قصہ چکایا نزع کا ہنگام تھا ۔۔۔ مجھکو بھی جانے کی جلدی تھی انھیں بھی کام تھا

ل سراج الحسن صاحب سراج لکھنؤ کے معروف شعرا میں سے ہیں قریب ۳۶، ۳۷ برس کی عمر ہے۔ بیس بائیس برس سے شعر کہتے ہیں، آپ کی شاعری نے کئی پلٹے کھائے ہیں اور مختلف ادوار میں مختلف احوال کی پابند رہی ہے۔ اول اول اپنے استاد باقر صاحب حمید اور پیارے صاحب رشید (جو لکھنؤ کے نامی گرامی مرثیہ گو تھے) کے اتباع میں آپ زبان اور روزمرہ کا زیادہ لحاظ کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ زمانہ کی دیکھا دیکھی اور ماحول کے اثر سے آپ کے یہاں ترکیبات بھی شروع ہوئیں اور وہ قدیم رنگ سرمہ مسی والا ——— متروک ہوتا گیا۔ اس رنگ میں سوز و گداز کا زیادہ خیال تھا۔ مگر سوز و گداز بیشتر مرثیت اور بین و بکا کی صورت میں رہا اسکے بعد شاعری کا رخ جدید الفاظ کی طرف مڑ گیا اور اب اکثر ایسے شعر بھی آپ کے یہاں ملتے ہیں جن میں زمانہ کے جدید رنگ اور عالمگیر ہوا کا اثر پایا جاتا ہے۔

سراج صاحب کی لیاقت علمی انگریزی میں انٹرنس تک ہے اسی کے ساتھ کچھ فارسی بھی پڑھی ہے سردست آپ کو مضامین نویسی سے بھی ایک لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ بہت سے مضامین لکھے ہیں بعض مضامین کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ کتب فن کی رائج کتابوں کا کبھی کبھی آپ مطالعہ کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں آپ لکھنؤ کی شاعری کے حامی بنکر اکثر لوگوں کے جواب بھی لکھتے رہتے ہیں۔

رشید

جناب عبدالرشید صاحب رشید لکھنؤ کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان شاعر ہیں انگریزی (ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۱۳۲ پر)

اعتراض رشید - اس مطلع پر غور کرو تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ شاعر کا مقصود شاعری سے صرف یہ ہو کہ شعر میں کسی نہ کسی طرح کوئی محاورہ ضرور نظم ہو - خواہ اس التزام سے مصرعوں میں ربط قایم رہے یا نہ رہے مطلع کے دونوں مصرعوں کے ٹکڑوں کو غور سے پڑھو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ محاورہ اور روزمرہ اس مطلع کا جزو اعظم ہے - الفاظ کے گورکھ دھندے کے سوا اس میں کچھ نہیں ہے - خدا جانے مصرعوں میں ربط کیا ہے معانی اس قدر ذلیل نکلتے ہیں کہ ان کے بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا - مطلب یہ ہے کہ نزع کے وقت وہ تشریف لائے مجھے بھی جانے کی جلدی تھی اور وہ بھی بوجہ ایک ضروری کام کے ٹھہر نہ سکتے تھے - اس لئے موت نے قصہ چکا دیا - اور میں قید حیات سے چھوٹ گیا - اب ذرا غور کرو -

(۱) معشوق کی موجودگی میں عاشق کے لئے جانے کی جلدی کیا معنی رکھتی ہے -

(۲) ضروری کام معشوق کی کونسی ادا ہے - اور ضروری کام کیا تھا - شاید غیر سے وعدہ ہو - شعر سے یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے -

(۳) نزع کے ہنگام کی تخصیص کوئی ترقی شعر میں پیدا نہیں کرتی -

(۴) قصہ چکانا یہ محاورہ اس موقعہ پر بولتے ہیں جب کسی معاملے میں اختلاف ہو اور تیسرا شخص فیصلہ کرے لیکن یہاں تو کوئی اختلاف کی امکانی صورت ہی نہیں اگر یہ صورت ہوتی کہ معشوق نزع کے وقت موجود تھا - اور افسانۂ دل سن رہا تھا - موت اور زندگی میں کشمکش تھی آخر موت غالب آئی وغیرہ وغیرہ تو اس وقت ایسے محاورہ کا صرف صحیح تھا - لیکن یہاں تو معاملہ ہی بالکل برعکس ہے - عاشق کو جانے کی جلدی - معشوق کو ضروری کام اور اس کے ٹھہرنے کی اُمید فضول ایسی صورت میں اس کے مرنے میں کونسی چیز سد راہ ہو سکتی تھی - لہٰذا اس محاورے کا صرف غلط - میں نہیں سمجھ سکتا کہ آخر اس مطلع میں کیا ہے -

---

(ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۳۱) میں بی اے تک تعلیم پائی ہے فارسی اور قدرے عربی سے بھی باخبر ہیں - تقریباً پندرہ برس سے شعر کہتے ہیں - جدت خیال - تازگی مضامین - ندرت بیان کے ساتھ بلندی جذبات کا بھی خیال رکھتے ہیں - نثر نگاری اور تنقید کا بھی اعلیٰ ذوق ان میں موجود ہے - نہایت نیک نفس - زندہ دل - دوست پرست خوش مزاج رنگین طبع ہیں - میرے قدیمی دوست مخلص کرم فرما ہیں - سراج صاحب کے بعض اشعار پر ان کی تنقیدیں شایع ہوئیں - جن کا جواب منشی قدیر احمد صاحب قدیرؔ لکھنوی نے دیا - رشید صاحب کی عمر اب ۳۰ سال کی ہے اور اکثر کتب بینی کا مشغلہ رہتا ہے -

(مولف) معترض کا یہ اعتراض ایک حد تک ناقابل قبول ہے کہ شعر محاورے کے لئے کہا گیا ہے بلکہ کہنا یہ چاہیئے تھا کہ اس قافیہ کے باندھنے کے واسطے یہ شعر کہا گیا ہے۔ جو شعر میں موجود ہے۔

پہلا اعتراض اس وجہ سے ہے کہ فاضل معترض نے خیال کیا ہے کہ معشوق پہلے سے موجود تھا۔ اس صورت میں یہ اعتراض کرسی نشین ہے ـــــ کیونکہ معشوق کی موجودگی میں نزع کی حالت ہونا۔ اور اگر وہ بحالت نزع آیا تھا، تو نزع کا قایم رہنا اصول موضوعہ شاعرانہ کے خلاف ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نزع کی صورت کسی اور وجہ سے بھی جدائی کی وجہ سے نہ تھی تو پھر شعر میں معشوق کے آنے جانے کا ذکر اور اس ذکر سے عاشق کے حیات و ممات کو وابستہ کرنا فضول سی بات ہے۔ شعر میں یہ ٹکڑا (نزع کا ہنگام تھا) اس لئے لایا گیا کہ معشوق نزع کے وقت آیا۔ یا اس وقت موجود تھا۔ مگر انصاف یہ ہے کہ اس سے شاعر کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اور اصلی معنی پردۂ اخفا میں رہتے ہیں۔

دوسرا اعتراض۔ ضروری کام والا کہ شاید غیر سے وعدہ ہو اگرچہ خیال میں آتا ہے مگر لازمی نہیں۔

تیسرا اعتراض بالکل صحیح ہے

چوتھا اعتراض بھی قرین قیاس ہے۔ یعنی قصہ چکانا اسی وقت بولا جاتا ہے۔ جب باہم کوئی کشمکش ہو۔ تو اس وقت کشمکش کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ معشوق و عاشق میں کشمکش تھی جانے اور نہ جانے پر۔ مگر یہ اسواسطے بعید معلوم ہوتی ہے کہ دونوں کو جانا تھا۔ پھر کشمکش کیوں تھی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ موت اور زندگی میں کشمکش تھی۔ اس حالت میں موت کو قصہ چکانا نہ چاہیے اس واسطے کہ دو جھگڑنے والوں میں ایک فریق فیصلہ کرنے کا کیونکر مجاز ہوا۔ انھیں صورتوں اور جرحوں کی وجہ سے شعر پر جو اعتراض ہوئے ہیں صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

سراج۔ وہ تبسم آشنا لب ہلکی سی جنبش کے ساتھ — سیکڑوں مفہوم تھے گو ایک ہی پیغام تھا

اعتراض۔ جنبش لب میں سیکڑوں مفہوم تو مضمر ہو سکتے ہیں لیکن وہ ایک پیغام نہ جانے کونسا ہے جس کا علم صرف شاعر کو ہے اسی کو کہتے ہیں المعنی فی بطن الشاعر۔

(مولف) واقعی ایک ہی پیغام کا مفہوم ذہن میں متعین نہیں ہوتا۔

سراج۔ جہاں اتنا دیا ہے ساتھ تم نے صبح کی تا دو — سرانجام مریض شام ہجراں دیکھتے جاؤ

اعتراض۔ بجائے انجام سرانجام فرمایا گیا ہے۔ حالانکہ سرانجام کے معنے انتظام کے ہیں نہ کہ نتیجے کے

اور سرانجام بمعنی انجام اگر اہل فرس کے یہاں رائج ہو تو بھی اس جگہ قابل استناد نہیں علاوہ اس کے تاروں کے ساتھ صبح کی تخصیص کیسی جبکہ وہ شام ہی سے نکلے ہوئے تھے۔

جواب قدیر۔ لفظ سرانجام بہ معنی نتیجہ شیخ سعدی نے استعمال کیا ہے ؎

سرانجام جاہل جہنم بود
کہ جاہل نکو عاقبت کم بود

ایک اور شاعر لکھتا ہے ؎

نہ ہندوم نہ مسلماں نہ کافرم نہ یہود
بحیرتم کہ سرانجام من چہ خواہد بود

یہ جو کہا گیا ہے کہ مراد عام تاروں سے ہے جو شام سے نکلے ہوئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جناب نے یہ کیسے فرض کرلیا۔ شعر تو صاف صاف بتا رہا ہے کہ شاعر کا کیا مطلب ہے یعنی اے صبح کے تارو جہاں تم نے اتنا ساتھ دیا ہے وہاں مریض شام ہجر کا نتیجہ بھی دیکھتے جاؤ۔ جسکے بہ الفاظ دیگر کھلے ہوئے یہ معنے ہوئے کہ اے صبح کے تارو قبل ڈوبنے کے ذرا مریض شام ہجر کا مرنا بھی دیکھتے جاؤ۔

(مولف) مجھے افسوس ہے کہ قدیر صاحب نے معترض کے اعتراض سے علحدہ ہوکر جواب دیا ہے۔ جب معترض یہ کہتا ہے کہ سرانجام بجائے انجام فارسی میں اگر ہو بھی تو یہاں قابل استناد نہیں ہے۔ تو پھر آپ کو یہ دو شعر جو بچے بچے کی زبان پر ہیں پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہاں کوئی اردو کا شعر پیش کرنا چاہیے تھا۔ اور جہاں تک خیال ہے اردو میں سرانجام بمعنی انجام متاخرین کے یہاں نہ ملیگا۔ شاید کسی نے متقدمین میں سے زبان فارسی کے تتبع میں لکھا ہو وہ قابل سند نہیں۔ تحقیق کلام یہ ہے کہ سرانجام سرآغاز کی طرح فارسی میں بولا جاتا ہے۔ مگر سر وہاں بھی زائد مستعمل ہے۔ کسی کام کے انتظام اور ترتیب دینے کے لئے بھی بولتے ہیں۔ جیسا کہ صائب کے اس شعر میں ؎

از تن زارم اگر رشتہ سرانجام دہند
مانع روشنی دیدۂ سوزن باشد

مگر یہ معنی مجازی ہیں کیونکہ کام کا مرتب ہونا اور کام کا انتظام ہونا آخر کار میں ہوتا ہے۔ اردو میں بھی لفظ سرانجام اسی مجازی معنے میں مستعمل ہے جیسا کہ میرانیس کے اس شعر میں بمعنی بندوبست لایا گیا ہے

وہ دشت نوردی و غم و صدمہ و آلام
منزل پہ بھی ممکن نہیں راحت کا سرانجام

مگر اصلی معنی میں انجام ہی بولا جاتا ہے اس لئے کہ کسی زبان کے زوائد ہمیشہ بجنسہ دوسری زبان میں منتقل نہیں ہوتے۔ لہذا جب تک کہ اردو میں دو چار شعر اس معنے کے نہ دیکھے جائیں سرانجام غلط نہیں تو غیر فصیح ضرور رہوگا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ سرانجام کی ایسی مثال متاخرین میں کہیں نہیں مل سکتی جہاں یہ لفظ انجام کے معنے میں آیا ہو۔

دوسرے اعتراض میں معترض اور مجیب دونوں مغالطے میں ہیں۔ نہ معترض نے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا اور نہ مجیب نے۔ بحث صبح کے تاروں پر ہے۔ معترض نے صبح کے تاروں سے وہ تارے مراد لئے ہیں جو صبح کے وقت طلوع ہوتے ہیں۔ اور مجیب نے وہ جو صبح کے وقت ڈوبتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ صبح کے تارے صبح کے ڈوبنے والے تاروں کو نہیں کہتے۔ صبح کو تو سب ہی تارے چھپ جاتے ہیں۔ اس میں تخصیص کیا ہے۔ البتہ صبح کا تارا اور صبح کا ستارا۔ زہرہ کو کہتے ہیں۔ مثال کے لئے دو شعر دیکھئے جن میں صبح کے تارے کا ذکر کرکے اس سے وہی صبح کا طلوع ہونے والا تارا مراد لیا ہے۔

نواب ؎ رات آخر ہوئی اور صبح کا تارا نکلا — مدعا دل کا نہ صد حیف ہمارا نکلا

ناسخ ؎ مُندا کانوں میں نہیں تعویذ بالوں میں نہیں — یہ ستارا صبح کا ہے وہ ستارا شام کا

جب یہ تسلیم کرلیا گیا کہ صبح کا تارا صرف صبح کے طلوع ہونے والے تارے زہرہ کو کہتے ہیں تو پھر "صبح کے تاروں" یعنی جمع کے ساتھ خطاب کے کوئی معنی نہیں۔ معترض کا یہ اعتراض بھی نہایت وزنی ہے کہ صبح کے تاروں کو مخاطب کیا ہے مگر مراد عام تاروں سے ہے جو شام سے نکلے ہوئے ہیں۔ فاضل مجیب فرماتے ہیں کہ یہ کیسے فرض کرلیا۔ غالباً انھوں نے (جہاں اتنا دیا ہے ساتھ) والے ٹکڑے کو غور سے نہیں دیکھا جس کے صاف صاف یہ معنے ہیں کہ جن تاروں سے خطاب ہے وہ شام سے مریض شام ہجراں کا ساتھ دے رہے ہیں۔

اس شعر میں یہ بھی کمی رہ گئی ہے کہ پہلے مصرع میں لفظ (جہاں) لایا گیا ہے جو دوسرے مصرع میں وہاں بھی چاہتا ہے۔ جس کا محذوف ماننا نہایت برا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے مصرع میں (بھی) کی بھی ضرورت ہے کیونکہ شعر کی نثر یوں ہونا چاہیے۔

اے صبح کے تارو جہاں تم نے اتنا ساتھ دیا ہے وہاں مریض شام ہجراں کا انجام بھی دیکھتے جاؤ۔

راج۔ سر محشر ذرا قاتل کے تیور تو کوئی دیکھے — کیا ہے جیسے اپنا خون ناحق آپ ہی میں نے

عتراض۔ کہنا یہ چاہیے تھا کہ جیسے اپنا خون میں نے آپ ہی کیا ہے۔ ناحق بالکل بیکار ہے۔

واب۔ شعر سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ قاتل نے عاشق کا خون ناحق کیا۔ مگر محشر میں اسکے تیور ایسے یں کہ گویا اس نے خون ناحق نہیں کیا بلکہ خود عاشق نے اپنا خون کیا ہے اور صرف خون ہی نہیں بلکہ خون حق۔ یہ اس وجہ سے کہ معشوق پر خون ناحق کا الزام ہے اور وہ اس الزام کو اپنے انقلاب پسند تیوروں ں زبردستی سے بیگناہ عاشق پر عاید کرنا چاہتا ہے۔ مہربانی فرما کر آپ شعر کی نثر کیجئے معنی خود بخود

آپ کی سمجھ میں آجائیں گے کہ لفظ ناحق کی شعر میں ضرورت ہے یا نہیں۔

(مولف) نقاد کا اعتراض ہے صرف لفظ ناحق پر کہ یہ زاید اور بے معنی ہے۔ زائد لفظ کی پہچان اور جانچ اسی طرح ہوتی ہے کہ شعر کی نثر کر کے دیکھ لیا جائے کہ اس کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اور یہاں خود مجیب نے اپنی نثر میں اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بلکہ زبردستی دوبارہ اس ناحق کے ٹکڑے کو شعر میں ملا دیا یہاں "ناحق" بالکل بیکار ہے۔ کیونکہ خون کی صفت ناحق واقع ہوا ہے جیسا کہ خود مجیب کا بھی خیال ہے۔ اگر اس کو صحیح مانا جائے گا تو معنے ترکیبی یہ ہوں گے کہ گویا میں نے اپنا خون کر لیا ایسا خون جو بالکل ناحق تھا۔ میرے نزدیک ناحق بالکل بیکار ہے۔

سراج۔ مری طرز روش اچھی نہیں اے حضرت ناصح — اُدھر جائیں گے آپ اچھا تو یہ ہر راستا میرا

اعتراض۔ طرز روش میں واؤ عاطفہ غائب ہے۔

جواب۔ طرز کو مع اضافت کے پڑھیے۔ اور دیکھیے کہ شعر معنی دیتا ہے یا نہیں۔

(مولف) اگرچہ طرز کو اضافت کے ساتھ پڑھنے سے معنے نکل آتے ہیں۔ مگر چونکہ دونوں لفظ ہم معنے ہیں اس واسطے اچھے نہیں معلوم ہوتے۔

سراج۔ دل کی بساط کیا تھی اک جز معاملہ تھا — ناحق فتور آیا ایمان میں کسی کے

اعتراض۔ جز بغیر ہمزہ یا واؤ کے صحیح نہیں یوں کہنا چاہیے تھا۔ دل کی بساط کیا تھی جزئی معاملہ تھا

جواب۔ بہار عجم میں لکھا ہوا ہے "در لغت عرب بمعنی پارہ است و در فارسی جزو بدون ہمزہ ظاہر الخفف ہماں عربی است چوں آخر اسمضاف نمایند بجیزے بجائے ہمزہ واؤ نویسند۔ گویند جزو طلا ہم طلا است۔ و ہم چنیں جزو بدن و جز آں۔ بہر تقدیر اسم است لیکن بہ اضافت مستعمل نیست۔"

آپ نے یہ بھی غور فرمایا کہ لفظ جز یہاں کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مہربان یہ روزمرہ کی اصطلاح ہے اور ہر اہل زبان اسے سمجھ سکتا ہے۔

(مولف) بوجہ محاورہ ہونے کے جواب صحیح ہے۔ اگرچہ محاورہ عوام کا ہے۔

سراج۔ پابند وضع کل تک تھا انتظام فطرت — اور آج اے شب غم تیری سحر نہیں ہے

اعتراض۔ انتظام فطرت کے لئے پابند وضع ہونا ایک نئی بات ہے۔ پابند نظم کہنا چاہیے۔

جواب - اول تو یہ بات نئی ہے نہیں - اور اگر ہے تو جناب سراج جدّت بندش پر خراج تحسین کے مستحق ہیں اس لئے کہ اس ترکیب میں کوئی غلطی نہیں ہے - اگر آپ لکیر کے فقیر ہیں تو ہوں بہر صورت شعر کا مطلب بالکل صاف ہے یعنی فطرت ہمیشہ سے اس نظام کی پابند ہے - الخ

(مولف) معترض کا اعتراض بالکل صحیح ہے - انتظام کے لئے پابند وضع کہنا سراسر غلط ہے - مجیب صاحب کا یہ جواب کہ اس ترکیب میں کوئی غلطی نہیں ہے بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص باپ کو بجائے قبلہ کے عزیز من کہکر جدت ترکیب کا دعویٰ کرے -

---

سراج - سرحشر بھی ہے قاتل مجھے پاس راز داری ترا نام لب تک آتا ہے مگر دبی زباں سے

اعتراض - دوسرا مصرع مہمل ہے - دبی زباں سے لب تک آتا ہے - عجیب وغریب بول چال ہے -

جواب - مہربان دل سے زبان تک جو بات آئیگی تو ظاہر ہے کہ کوئی چیونٹی وغیرہ نہیں جو رینگ کر چپکے سے زبان تک چلی آئے اور کسی قسم کی آواز نہ پیدا ہو - کلیہ یہ ہے کہ جب کسی کا نام لیا جائے گا تو کم وبیش صدا ضرور پیدا ہوگی - اسی طرح جب کسی مخصوص راز کی بات کسی سبب سے بیان کرنا ہوتا ہے تو اسے دبی زبان سے کہنا بولتے ہیں - چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ حشر کے روز بھی جبکہ کسی بات کو صیغۂ راز میں کہنا ناممکن ہے قاتل کا نام دبی زبان سے لب تک آیا - اسی کا نام پاس وفا ہے - کم از کم مجھے تو اس شعر میں کوئی غلطی نظر نہیں آتی -

(مولف) اعتراض صحیح ہے - دوسرے مصرع کی نثر نہیں ہوسکتی -

سرخوش[۱] و معترض

ایک مرتبہ ناصر علی کی تعریف میں کچھ شعر کہے ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے -

باشعر علی نمی رسد شعر کسے زانساں کہ خطِ کس بخط میر علی

---

[۱] محمد افضل نام تھا - عبد اللہ خاں زخمی شاہجہاں آبادی کی سرکار کے نمک خوار تھے - خوشگو شخص تھے - ایک تذکرہ موسوم بہ کلمات الشعرا ان سے یادگار ہے - ۱۰۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور پچاس برس کی عمر پاکر ۱۱۰۰ھ میں بمقام دہلی انتقال کیا - یہ محمد علی ماہر - اور موسوی خاں فطرت کے شاگرد تھے - شیخ ناصر علی سرہندی کے بڑے دوست تھے -

جب یہ شعر کسی جگہ سنائے گئے تو اسی جلسہ میں ایک شخص نے اعتراض کیا کہ رسد کا تعدیہ حرف با کے ساتھ جیسا کہ اس شعر کے پہلے مصرع میں ہے سنا نہیں گیا

جواب آزاد بلگرامی۔ سد موجود ہے۔ قلی سلیم طہرانی

بالطف ساعدت ید بیضا نمیرسد بیش لبت سخن بہ مسیحائی رسد

سعدی و میر نور اللہ احراری

میر نور اللہ احراری سعدی کی مایہ ناز تصنیف گلستان کے شارح ہیں۔ شرح کے ضمن میں جہاں جہاں مناسب سمجھا ہے اعتراضات بھی کئے ہیں۔ سعدی کا شعر ہے۔

وَاِن سَلِمَ الانسان من سوءِ نفسہ فَمِن سوءِ ظنّ المدّعی لیس یَسلَمُ

یعنی اگر آدمی اپنے نفس کی برائی سے سلامت بھی رہا تو دشمن کی بدگمانی سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

اعتراض میر نور اللہ احراری۔ مصرع ثانی میں لیس یَسلَمُ سے زیادہ فصیح لا یسلم ہے اس واسطے کہ لیس کے ہونے سے مصرع بڑھتا ہے

جواب میر عبد الجلیل بلگرامی۔ یہ بیت بحر طویل کے ان تین وزنوں میں سے ایک ہے جس کا عروض اور ضرب مقبوض آتا ہے۔ اور مصرع ثانی کی جس میں بحث ہے تقطیع اس طرح کی جائیگی۔ فمن سو (فعولن)، ءِ ظنّ المد (مفاعیلن) دعی لے (فعولن) سس یسلم (مفاعلن)۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ تقطیع حقیقی طور پر یوں ہے تو معلوم ہوا کہ لیس یسلم صحیح ہے نہ کہ لا یسلم جیسا کہ شارح کا گمان ہے۔ کیونکہ لیس کا لام اور (ے) تقطیع میں لفظ دعی کے ساتھ ترکیب پاکر فعولن کے وزن پر ہوتا ہے اور لیس کا سین لفظ یسلم میں مل کر سَیَسلِمُ ہو جاتا اور مفاعلن کے وزن پر آجاتا ہے۔ کیونکہ ضرب مقبوض ہے۔ اب رہا معترض کا یہ قول کہ لا یسلم ہونا چاہئے اس میں لفظ لا، دعی کے ساتھ مرکب ہو کر فعولن ہو گا اور یسلم فاعلن کے وزن پر آئیگا اور فاعلن بحر طویل میں آتا نہیں ہے۔ اسواسطے کہ بحر طویل میں ضرب ہوتی ہے یا مقبوض یا محذوف اور فاعلن ان تینوں قسموں سے علیحدہ ہے۔ پھر اس حالت میں میر صاحب کا یہ فرمانا کہ لیس سے مصرع زیادہ ہوتا ہے کم از کم میزان عروض کے مطابق تو ہے نہیں میر صاحب کی میزان طبع کے موافق ہو گا اور مزا یہ ہے کہ لا یسلم کی صورت میں مصرع کم ہوتا ہے اور کس قدر مناسب ہے یہ بیت جو خلیل بن احمد واضع فن عروض نے بحر طویل کے دوسرے وزن کے لئے مثالاً پیش کی ہے۔

ستبدی لک الایام ماکنت جاہلاً ۔۔۔ ویاتیک بالاخبار من لم تزوّد

میر صاحب کی یہ عبارت کہ لا یسلم زیادہ فصیح ہے کیونکہ لیس ہونے کی صورت میں مصرع بڑھتا ہے بہت ہی عجیب و غریب ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصرع ناموزوں ہوتا ہے تو وہ مخل فصاحت ہوتا ہے گویا وزن عروضی کو عدماً اور وجوداً فصاحت شعر میں کوئی دخل ہے حالانکہ علمائے معانی میں سے کسی عالم نے فصاحت کی یہ تعریف نہیں لکھی۔

سلمان ساوجی[۱] و مولانا آزاد بلگرامی

سلمان ساوجی۔ چہ طپی ایدل وامانده چو ماہی بر خشک ۔۔۔ جاں بپرور کہ بجو آب رواں باز آمد

اعتراض۔ اگر مصرع اولیٰ یوں ہوتا تو اور ہی لطف پیدا ہو جاتا ؎

چہ طپی ایدل وامانده چو ماہی بر در

(مولف) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا کی اس اصلاح سے شعر میں حقیقی ترقی کیا ہوئی ہے۔ اس لئے ماہی کو خشکی پر تڑپنا چاہئے نہ کہ دروازے پر۔ اگر اصلی الفاظ یہی ہیں اور کاتبان غلط نویس نے مولانا کی اصلاح پر اصلاح نہیں کی ہے تو کسی صورت سے سلمان کے مصرع سے یہ مصرع بہتر نہیں ہے۔

سنجر کاشانی[۲] و آزاد بلگرامی

سنجر کاشانی۔ بخسرو گو کہ شیر میں دیدز اصطرلاب آئینہ ۔۔۔ کہ فتح بیستوں از بازوئے فرہاد می آید

---

[۱] سلمان ساوجی وہ مشہور و معروف شاعر ہے جسکے کلام سے حافظ نے بھی استفادہ کیا ہے۔ اور اس کی مدح میں اس طرح رطب اللسان ہوا ہے ؎

سر آمد فضلائے زمانہ دانی کیست ۔۔۔ زراہ صدق و یقین نے زراہ کذب و گماں

شہنشہ فضلا بادشاہ ملک سخن ۔۔۔ جمال ملت و دیں خواجۂ جہاں سلماں

چالیس سال تک امیر حسن اور اس کی حرم و شاد خاتون اور سلطان اویس کی مدح گستری کرکے مستعفی ہوا اور بعض کے نزدیک ۷۷۸ھ میں بعض کے نزدیک ۷۶۹ھ میں بعض کے نزدیک ۷۸۵ھ میں وفات پائی۔ مولانا آزاد بلگرامی نے اسکے ایک شعر پر یہ اصلاح دی ہے۔

[۲] سنجر میر حیدر معمائی کاشانی کا لڑکا تھا۔ اول اول شاہنشاہ اکبر اور حاشیہ نشینان دربار اکبری کا مداح رہا اور میرزا جانی حاکم ٹھٹھہ اور اس کے صاحبزادے مرزا غازی کی ثنا گستری میں اوقات گزاری بعد ازاں (ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۱۴۰)

اعتراض آزاد - اصطرلاب حوادثات کوئی کے پہچاننے کے واسطے نہیں ہوتا جس کا استعمال اس جگہ جائز و درست ہو بلکہ یہاں علم رمل - نجوم شانہ وغیرہ کا ذکر مناسب تھا - مصرع یوں ہوتا تو بہت اچھا تھا ؎

بخسرو گو کہ شیریں دیدہ ہست از شانۂ گیسو

(مولف) اعتراض صحیح ہے - اُصطرلاب ایک آلہ ہوتا ہے جو پیتل سے بنا ہوا ہوتا ہے اور مدور ہوتا ہے اور اُس سے ستاروں کی بلندی اور آفتاب کا ارتفاع معلوم کرتے ہیں - (اصطر یونانی میں ترازو کو کہتے ہیں اور لاب آفتاب کو - چونکہ اس آلہ سے اکثر آفتاب کے حالات معلوم کرتے ہیں - اس واسطے اس کو آفتاب سے منسوب کیا گیا)

مولانا کی اصطلاح بلحاظ تناسب الفاظ نہایت مناسب ہے - سنجر کے یہاں چونکہ آئینہ کو اصطرلاب کہا گیا ہے یہ بھی کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ آئینہ منقش نہیں ہوتا اور اُصطرلاب پر نقوش ہوتے ہیں لفظ شانہ بہت مناسب ہے کیونکہ شانہ حوادث کے دریافت کرنے کا ایک علم ہے - جو شگون اور فال سے مراد ہے - فال اور شگون بتانے والے کو شانہ بیں کہتے ہیں - اور اس عمل کو شانہ بینی -

---

میر سنجر نے سترہ شعروں کا ایک قطعہ اپنے باپ میر حیدر کے پاس بھیجا تھا جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

پدرا صاحبا خدا وندا — اے تو مر بندہ را خدای دوم
دعوتت از دعاے حق واجب — خدمتت از نماز فرض اہم

اعتراض - اس قطعہ میں حرکت ماقبل روی فتح ہے - یعنی میم سے پہلا حرف مفتوح ہونا چاہئے مگر دوم کا واو مضموم ہے - اس واسطے کہ تمام اہل زبان اعداد میں حرکت مضموم لاتے ہیں چنانچہ آذری کے اس شعر میں یہی ہے ؎

اے خطت اول شب رازدہ بر صبح دوم — ابروت چشم سیہ کردہ بخون مردم

پس اس صورت میں اختلاف توجیہ لازم آتا ہے جو کسی حالت میں جائز نہیں ہے -

---

(ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۳۹) ایک طویل قصیدہ ابراہیم عادل شاہ کی تعریف میں کہکر نذر گزرانا بادشاہ نے ایک خلعت فاخرہ اور نہایت بیش بہا زمرد کی انگوٹھی انعام دی - یہ ہنوز بیجاپور میں مقیم تھا کہ شاہ عباس صفوی کا فرمان طلب پہونچا - مگر قبل وصول فرمان شاہی کے فرمان قضا پہونچگیا اور ۱۰۲۱ھ میں داعی اجل کو لبیک کہکر راہی فنا ہوا - نہایت خوش فکر شاعر تھا — ایک دیوان اس کی یادگار ہے جو کم یاب بلکہ نایاب ہے -

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں واجب کہا گیا ہے یہاں اوجب ہونا چاہیے اس لئے کہ دوسرے مصرع کے آخر میں بھی لفظ اہم صیغہ افعل التفضیل لایا گیا ہے۔

(مولف) پہلا اعتراض صحیح ہے لیکن دوسرے اعتراض میں یہ کہنے کی گنجائش باقی ہے کہ یہ کوئی غلطی نہیں ہے بلکہ اگر پہلے مصرع میں بھی اہم کے جواب میں افعل التفضیل کا صیغہ لے آتے تو اور بہتر تھا۔ ورنہ ایسا بھی اکثر ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ واجب کے مقابلہ میں اوجب غیر فصیح ہے۔

مرزا رفیع سودا[۱] - و انشا

سودا - راجہ نرپت سنگھ کے ہاتھی کی ہجو میں کہتے ہیں ؎

تم اپنے فیل معنی کو نکالو مرے ہاتھی سے دو ٹکر لڑا لو

---

[۱] سودا میر کے معاصر اور اپنے زمانہ کے مشہور شاعر تھے۔ ان کا نام میرزا رفیع اور باپ کا نام مرزا محمد شفیع تھا۔ اُن کے والد تجارت کرتے ہوئے کابل سے ہندوستان پہونچے شہر دلی اس زمانے میں تمام اہل کمال۔ تاجروں اور ہنرور لوگوں کا مامن و مسکن تھا۔ یہیں کی خاک دامنگیر نے ان کا بھی دامن کھینچ لیا۔

سودا ۱۱۲۵ھ میں یہیں پیدا ہوئے۔ یہیں کی مٹی سے گوشت پوست بنا یہیں کی خو بو۔ یہیں کا رنگ ڈھنگ یہیں کی وضع قطع اختیار کی۔ یہیں تعلیم و تربیت پائی یہیں شاعری شروع کی یہیں کے مشہور و معروف استاد شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ مگر آب و دانہ اور خاک گور کی کشش نے آخر عمر میں وطن سے نکالا۔ دلی کی خانہ جنگیوں اور دشمن کے حملوں نے سوائے میر درد کے اور کسی کے یہاں قدم جمے نہ رہنے دیئے یہ بھی مسافر رہنورد بنکر وطن سے نکلے اور پہلے سیدھے فرخ آباد پہونچے نواب بنگش کے پاس رہے۔ پھر خاک گور کھینچکر لکھنؤ لے آئی۔ اور وہاں ۱۱۹۵ھ میں ہمیشہ کے لئے آغوش لحد میں سو گئے۔

انشاء اللہ خاں انشا

انشاء اللہ خاں نام تھا اور میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے اسلاف نامدار کشمیر سے آئے اور دہلی میں بود و باش اختیار کر لی نہایت شریف النسب اور فاضل اجل تھے اردو عربی فارسی ترکی مرہٹی گجراتی سب زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ نظم میں تمام اصناف کے ماہر۔ عروض و قوانی کے جاننے والے۔ زبردست نقاد تھے۔ مزاج میں ظرافت اور شوخی کوٹ کوٹ بھری ہوئی تھی۔ سن کہولت میں دلی سے نکل کر لکھنؤ آئے اور بڑے بڑے (ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۴۲)

اعتراض انشا - دوٹکر کی بجائے - دوٹکریں لکھنا چاہئے

جواب آزاد - یہ سید صاحب کی سینہ زوری ہے -

(مولف) آزاد نے سینہ زوری کا جواب تو دیدیا - مگر یہ نہ لکھا کہ انشا کی سینہ زوری کیا ہے - واقعہ یہ ہے کہ دلی والے اب تک اس بات کا خیال نہیں رکھتے - وہاں برابر اسی طرح بولتے ہیں - میری دو بات سن لو مجھے آپ سے دو بات کہنا ہیں - اور لکھنؤ میں اس کی پابندی کیجاتی ہے کہ اگر ایک جملہ میں ایک سے زیادہ اعداد لائیں گے تو اس کے ساتھ اسم کو بھی بطریق جمع بولیں گے - میں جب لکھنؤ کے پہلے مشاعرہ میں شریک ہوا تو مینے یہ شعر پڑھا ؎

اٹھی ہاں ہاں ابھی جاتا ہوں ظالم تیری محفل سے — مجھے دو بات کرنے دے مرے بچھڑے ہوے دل سے

"دو بات" پر مجھے لوگوں نے دیکھا - کیونکہ یہاں کی بول چال کے موافق مجھے دو باتیں کہنا چاہیئے تھا - بعض لوگوں نے مجھ سے پوچھا - کہ آپ کا دولت خانہ کہاں ہے - میں نے سوچا کہ آخر میں بھی انسان ہوں ہیں کی وضع قطع ہے - مجھے کیونکر پہچان لیا - آخر یہ راز معلوم ہوا - اب جو سنتا ہوں تو خود میرے کانوں کو برا معلوم ہوتا ہے - یہی سید انشا کو خیال ہوا - اتفاق کی بات ہے کہ دریائے لطافت اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہے - نہیں تو اعتراض اور محل اعتراض - نوعیت اعتراض کو دیکھ لیتا - سمجھ لیتا - پھر بھی جہاں تک مجھے یاد ہے - انشا نے اُسی محل پر لکھا ہے - جہاں دلی اور دوسری جگہ کی زبان کے فرق دکھائے ہیں -

---

سودا و فدوی

سودا نے تو اپنے کلیات میں فدوی کو ہر جگہ یہی لکھا ہے کہ بقال بچہ ہے - پنجاب کا رہنے والا ہے مگر قدیم تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ فدوی اس وقت دو تھے اور دونوں شاہجہاں آباد کے رہنے والے

(ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۴۱) مشاعروں میں شریک ہوئے، شعرا اور فضلائے عصر سے معرکے ہوئے - سنہ ۱۲۳۳ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا - ایک کلیات ان سے یادگار ہے جس میں ہر قسم کا کلام نظم جمع ہے - کھٹملوں - مچھروں - مکھیوں تک پر بڑی مثنویاں اور نظمیں ہیں - ایک کتاب دریائے لطافت ہے جسے معانی و بیان کی کتاب کہئے یا تنقید کی منطق کا رسالہ کہئے یا فلسفۂ زبان کا سب کچھ موزوں ہے - اس میں بعض بعض اعتراض بھی کئے ہیں ایک جگہ سودا پر بھی کرم کیا ہے

ایک کا محمد محسن نام تھا - دوسرے کا مرزا بھچو - مگر محمد محسن فدوی کا ذکر سودا کے معاصر میر حسن نے متقدمین میں کیا ہے اور مرزا بھچو کا اپنے معاصرین اور متاخرین میں - اس لئے جن فدوی سے سودا کا معرکہ ہوا ہے وہ در اصل پنجاب کے باشندے تھے - ان کا نام مکند لال تھا - ریحان شباب ہی میں مسلمان ہو گئے تھے اصل وطن لاہور تھا - مگر دلی میں مقیم تھے اور نواب ضابطہ خان کے وظیفہ خواروں میں تھے - شاہ صابر علی کے شاگرد تھے - یہ بزرگ عہد محمد شاہی کے بڑے نامور اور مشہور و معروف شاعر تھے - فدوی نہایت حسن پرست، اور جانباز عاشق مزاج شاعر تھے - اسی حسن پرستی کی بدولت بہت سے جھمیلے ہوئے لڑائیاں ہوئیں - معرکے رہے - بعض بعض دفعہ انہیں باتوں میں چھری کٹار تک کی نوبت آ گئی - اور یہ سخت زخمی ہوئے - نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے لکھا ہے کہ بعض اہل تذکرہ کہتے ہیں کہ فدوی قوم مغل سے تھے - فدائی بیگ نام تھا - سودا سے ان سے کسی طرح چل گئی اور ہجو گوئی کا ایک رن پڑ گیا - سودا برہنہ شمشیر تھے - مگر میاں فدوی بھی کچھ ایسے ویسے نہ تھے کہ دب جاتے - انھوں نے بھی لے ڈالا اور ایسی خبر لی کہ سودا بھی کانپ گئے ہوں گے - مگر افسوس ہے کہ ان کی کہی ہوئی ہجویں ملتی نہیں ہیں - ایک مصرع اور ایک بیت میاں آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے :-

کچھ کٹ گئی ہے بنی کچھ کٹ گیا ہے ڈورا ‎ ‎ ‎ ‎ دُم داب سامنے سے وہ اڑ چلا لٹورا

بھڑوا ہے مسخرا ہے سودا اُسے ہوا ہے

بہر حال یہ معلوم ہوتا ہے کہ فدوی بڑے دبنگ آدمی تھے اور فن شعر و انشا سے واقفیت رکھتے تھے اسی واقفیت نے خود بیں بنا دیا تھا - جیسے بعض لوگوں کی خصلت ہوتی ہے کہ ہر ایک کے کلام پر ایراد اور اعتراض کرتے ہیں ایسے ہی فدوی بھی تھے جسے دیکھا دو سنا دیں - جس کو پایا اوسی سے لڑ بیٹھے - سودا نے اعتراض و جواب یوں نظم کیا ہے :-

شعر پہ ہر ایک کے کرتے ہیں وہ اعتراض ‎ ‎ ‎ ‎ جامی کے دیواں سے خوب جانیں ہیں اپنی بیاض

سب پہ کرے ہے وہ طعن جتنے کہ استاد ہیں ‎ ‎ ‎ ‎ شعر پہ میرے بھی اب ان کے یہ ایراد ہیں

شعر وہ میرا سنا جا کے انھوں نے کہیں ‎ ‎ ‎ ‎ شیخ و برہمن کو ہے جس میں کہ نسبت بہ دیں

اپنی سخن فہمی پر کہتے ہیں وہ ہو کے گرم ‎ ‎ ‎ ‎ دین تو ہے شیخ کے اور برہمن کے دھرم

اس کا سخن پوچ ہے آپ ہے وہ پوچ تر ‎ ‎ ‎ ‎ شاعری و شعر پہ کچھ نہیں رکھتا خبر

سن کے غرض میں یہ بات بولوں ہوں جل ہُنگ آب ‎ ‎ ‎ ‎ کھولکے ٹک گوش فہم سن لیں یہ احباب سب

میری زبانی انھیں گر ہیں یہ قرآن خواں ‎ ‎ ‎ ‎ پوچھے تو اتنا کوئی ان میں سے اے مہرباں

آیۂ قرآن کو کیوں دہوئے ڈالو ہو تم — کافروں کو ہے خطاب جس میں لکم دینکم
دونوں پہ اطلاق دیں از روئے قرآں ہے — خواہ برہمن کوئی خواہ مسلمان ہے
شیخ ہی سمجھے ہو دین کی نسبت فقط — اپنی زلیخائی پر کتنے ہو بر خود غلط
دین اگر ہووے ایک جمع نہ ادیان ہو — وہ ہی نہ سمجھے اسے اُن سا جو نادان ہو
ان کا غرض اعتراض دیکھو تو معقول ہے — بات جو معروف ہے اُنہ وہ مجہول ہے
شعر کی اُن کی سند دیکھ لیں حق کا کلام — اپنی غلط فہمی پر طعن کریں ہیں مدام

(مولف) فدوی کا اعتراض یہ تھا کہ دین فقط مسلمان یا شیخ کے لئے کہہ سکتے ہیں۔ برہمن کو دین سے مطلب نہیں۔ سودا نے جو کچھ جواب دیا وہ قاعدہ سے صحیح ہے اس لئے کہ دین کے معنی مذہب کے ہیں۔ مگر انصاف یہ ہے کہ اردو شاعری میں دین برہمن کے لئے شاید کہیں مستعمل نہیں اور اگر کہیں ہو بھی تو اس شذوذ کی عمومیت کا فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ دین موسوی۔ دین عیسوی وغیرہ تو اردو فارسی میں ہے۔ جیسے ذوق کا یہ مصرع ؎

عیسائی اپنے دیں پہ ہے موسائی اپنے دیں پہ ہو

مگر دین برہمن کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ دیکھئے عرفی دین کے لفظ کو چھوڑ کر کیش کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

بہ کیش برہمناں آنکس از شہیدان است — کہ در عبادت بُت روئے بر زمیں میرد

غالب بھی یوں بچا کر کہتے ہیں ؎

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے — مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

سودا نے قرآن شریف کی آیت کو سپر بنا لیا ہے اُس کے ہوتے ہوئے کس کو انکار کی گنجائش ہے اور کون کافر ہے جو سر تسلیم خم نہ کرے مگر قرآن شریف زبان کے قواعد اور محاورات کو بدلنے اور دنیا کے مختلف حصص زمین کی زبانوں اور محاوروں کے غلط ثابت کرنے کے لئے نہیں آیا ہے۔

شررؔ[1] و سجادؔ

شرر۔ بعد مدت کے لکھا یار نے لو کر کاغذ — بھول آیا ہے وہیں ہائے پیمبر کاغذ

---

[1] آپ کا نام عبد الحلیم تھا غدر ۱۸۵۷ء کے تین سال بعد لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بزرگ چونکہ دربار واجد علی شاہی